خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

جلد ۲ / شمارہ ۷

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

اگست ۲۰۲۴ء بمطابق صفر ۱۴۴۵ھ

قصیدۂ امامِ شافعی رحمۃ اللہ علیہ

حماس الفتح معاہدہ اور چین کا کردار

ہمارے عقائد پر جدید تعلیم کے اثرات

ليتفقهوا في الدين

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
(اقبال)

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين

ماہ نامہ مَفَاہِیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کا داعی ادارہ

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

مضامین

۱	کیا خبر کیا سزا مجھ کو ملتی	اقبال عظیم	۳
۲	نکل کر خانقاہوں سے	مدیر	۵
۳	قصیدۂ امامِ شافعی رحمہ اللہ	مولانا محمد اقبال	۹
۴	الحاد اور مذہب کی بحث	مولانا معراج محمد	۱۴
۵	ہمارے عقائد پر جدید تعلیم کے اثرات	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	۱۷
۶	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ	صوفی جمیل الرحمٰن عباسی	۲۵
۷	حماس الفتح معاہدہ اور چین کا کردار	مولانا عبدالغفور صدیقی	۳۱
۸	امتِ مسلمہ کی خصوصیت: اعتدال اور میانہ روی	مولانا عبدالمتین	۳۷
۹	کتاب "احیاء علوم الدین" اور موضوع روایات	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۴۶
۱۱	شوقِ شہادت	مولانا حماد احمد ترک	۴۹
۱۲	حماس کے رہنما جو طوفان الاقصیٰ میں شہید ہوئے		۵۹

نعت

اقبال عظیم

کیا خبر کیا سزا مجھ کو ملتی

کیا خبر کیا سزا مجھ کو ملتی، میرے آقا نے عزت بچالی
فردِ عصیاں مری مجھ سے لے کر، کالی کملی میں اپنی چھپالی

وہ عطا پر عطا کرنے والے اور ہم بھی نہیں ٹلنے والے
جیسی ڈیوڑھی ہے ویسے بھکاری، جیسا داتا ہے ویسے سوالی

میں گدا ہوں مگر کس کے در کا؟ وہ جو سلطانِ کون و مکاں ہیں
یہ غلامی بڑی مستند ہی، میرے سر پر ہے تاجِ بلالی

میری عمرِ رواں بس ٹھہر جا، اب سفر کی ضرورت نہیں ہے
ان کے قدموں میں میری جبیں ہے اور ہاتھوں میں روضے کی جالی

اِس کو کہتے ہیں بندہ نوازی، نام اِس کا ہے رحمت مزاجی
دوستوں پر بھی چشمِ کرم ہے، دشمنوں سے بھی شیریں مقالی

میں مدینے سے کیا آگیا ہوں، زندگی جیسے بجھ سی گئی ہے
گھر کے اندر فضا سونی سونی، گھر کے باہر سماں خالی خالی

کوئی بادِ مخالف سے کہدے، اب مری روشنی مجھ سے چھینے
میں نے آنکھوں کی شمعیں بجھا کر، دل میں طیبہ کی شمع جلالی

میں فقط نام لیوا ہوں ان کا، ان کی توصیف میں کیا کروں گا
میں نہ اقبالؔ خسروؔ، نہ سعدیؔ، میں نہ قدسیؔ نہ جامیؔ، نہ حالیؔ

* * * * *

اداریہ

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

ہمیں اسماعیل پر حیرت ہے نہ اسرائیل پر! ''نہ اُن کی رَسم نئی ہے نہ اپنی رِیت نئی''۔ تو ایک اور ''مکتب کی کرامت اور فیضانِ نظر'' کے شاہ کار نے ''نکل کر خانقاہوں سے رسمِ شبیری ادا کر دی'':

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعیل

مذکورہ بالا شعر دورِ قدیم کی داستانِ حرم کو بیان کرتا ہے ورنہ دورِ جدید میں شاہ اسماعیل شہید سے لے کر ''شیخ اسماعیل شہید'' تک بہت سے نئے کردار شامل ہو چکے۔ قدیم روش پر چلنے والے ''جدید اسماعیل'' کا پورا نام اسماعیل عبدالسلام احمد ہنیہ ہے۔ آپ کی پیدائش ۲۳ مئی ۱۹۶۳ء کو قطاعِ غزہ میں، غزہ شہر سے چار کلو میٹر دور بحرِ ابیض المتوسط (Mediterranean sea) کے کنارے آباد ہونے والے الشاطی مہاجر کیمپ میں ہوئی۔ آپ کا خاندان ۱۹۴۸ء میں یہودیوں کی جبری بے دخلی کے نتیجے میں عسقلان کے ایک قصبے الجورہ سے آکر یہاں آباد ہوا تھا۔ الشاطی مجاہدین کی سرزمین ہے۔ حماس کے بانی شیخ احمد یاسین (شہادت ۲۰۰۴ء) حماس کے اسلحہ ساز شیخ عدنان الغول (ش ۲۰۰۴ء) اور معروف راہنما صلاح الشحادہ (ش ۲۰۰۲ء) کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور نشو و نما صوفی مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اسماعیل ہنیہ کے ایک انٹرویو کے مطابق ان کے والد ایک صوفی اور شیخِ طریقت تھے جن کے پاس اکثر اوقات مشائخ تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کے گھر کی قریب ہی ایک خانقاہ ہوا کرتی تھی جس میں ان کے والد ذکر کی مجالس کا انعقاد کیا کرتے تھے اور اسماعیل ان کے ساتھ مجالس میں جایا کرتے تھے۔ یہاں مولود شریف کی محفلیں ہوا کرتیں، تین روزہ تعزیتی جلسے ہوا کرتے جن میں قرآن مجید پڑھا جاتا۔ اسماعیل ہنیہ بھی ان جلسوں میں قرآن شریف پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ان

کے والد صاحب ایک مسجد کے موذن بھی تھے۔ جب وہ نمازِ فجر کی اذان کے لیے مسجد تشریف لے جاتے تو ننھے اسماعیل چراغ ساتھ لے کر جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اسماعیل ہنیہ کی شخصیت میں ''مکتب کی کرامت اور فیضانِ نظر'' دونوں نظر آتے ہیں۔

اسماعیل ہنیہ نے ابتدائی تعلیم اقوامِ متحدہ کے پناہ گزین اسکول میں حاصل کی۔ ثانوی تعلیم انھوں نے غزہ کے ایک ادارے معهد الأزهر الديني سے حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ نے الجامعة الإسلامية غزة کا رخ کیا۔ شیخ احمد یاسین رحمہ اللہ اور حماس کے رہنما حسن ابو شنب اس جامعہ کے بورڈ میں شامل تھے۔ یہاں سے آپ نے عربی زبان و ادب میں ماسٹر کی ڈگری مکمل کی۔ اس کے بعد آپ کچھ عرصہ اسی جامعہ میں اہم مناصب پر فائز رہے۔ ۲۰۰۹ء میں آپ کو اسی جامعہ نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

دورانِ تعلیم آپ ایک بہترین اسپورٹس مین تھے اور فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ اسکول کی تعلیم کے دوران آپ مجلسِ اتحادِ طلبہ کے سرگرم رکن بلکہ ۱۹۸۳، ۸۴ میں اس تنظیم کے صدر بھی رہے۔ یہ تنظیم، طلبہ میں نظم و ضبط، صحت مند جسمانی مشاغل، انسانی حقوق، ملی ذمے داریوں اور جمہوری اقدار کا شعور عام کرتی تھی۔ اس دوران اسماعیل ہنیہ بعض مساجد میں خطبات بھی دیا کرتے تھے۔ دورانِ تعلیم ہی آپ کا تعلق شیخ احمد یاسین شہید رحمہ اللہ اور ان کی تحریک حماس سے قائم ہو چکا تھا اور آپ تحریک میں سرگرم اور فعال کارکن کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ ۱۹۸۷ء میں آپ کو پہلی بار اٹھارہ دن کے لیے پابندِ سلاسل کیا گیا۔ اگلے سال آپ کو چھ مہینے کے لیے قید کیا گیا۔ ۱۹۸۹ء میں آپ کو تین سال کے لیے قید کیا گیا۔ قید مکمل ہونے کے بعد آپ کو جنوبی لبنان کے علاقے مرج الزہور میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۷، دسمبر ۱۹۹۲ء کو معاہدۂ اوسلو کے بعد آپ کو واپسی کی اجازت ملی۔ جلاوطنی ختم ہونے کے بعد آپ جامعہ اسلامیہ کے ڈین مقرر کیے گئے۔ ۱۹۹۷ء میں شیخ احمد یاسین رحمہ اللہ نے آپ کو اپنے دفتر کا مدیر مقرر کیا۔

۲۰۰۳ء میں جب شیخ احمد یاسین رحمہ اللہ پر قاتلانہ حملہ ہوا تو اسماعیل بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ دونوں حضرات اللہ کے حکم سے محفوظ رہے۔ شیخ احمد یاسین رحمہ اللہ کو ۲۲ مارچ ۲۰۰۴ء کو اسرائیلی گن شپ ہیلی

کاپٹروں سے اس وقت شہید کر دیا گیا جب وہ فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آرہے تھے۔

شیخ احمد یاسین رحمہ اللہ کی شہادت کے بعد عبد العزیز رنتیسی رحمہ اللہ حماس کے سربراہ منتخب ہوئے۔ چند ہفتوں بعد رنتیسی رحمہ اللہ بھی ہیلی کاپٹر سے کیے گئے میزائل حملے میں جامِ شہادت نوش کر گئے۔ عبد العزیز الرنتیسی رحمہ اللہ کی شہادت کے بعد ۲۰۰۴ء سے ۲۰۰۷ء تک حماس نے حملے کے خدشے کے پیشِ نظر اپنے سربراہ کا نام مخفی رکھا۔ ۲۰۰۷ء میں اسماعیل ہنیہ حماس کے سربراہ کے طور پر سامنے آئے۔ ۲۵ جنوری ۲۰۰۶ء کو فلسطین میں انتخابات ہوئے جس میں حماس نے کامیابی حاصل کی۔ حماس نے اسماعیل ہنیہ کا نام بطورِ وزیرِ اعظم تجویز کیا اس طرح مارچ ۲۰۰۶ء میں آپ فلسطین کے وزیرِ اعظم قرار پائے۔ آپ کی وزارتِ عظمی کا دور لگ بھگ ایک سال پر محیط رہا۔ مغربی ممالک نے عوامی مینڈیٹ کے حامل اس منتخب وزیرِ اعظم کے خلاف مختلف قسم کی سازشیں شروع کیں۔ نتیجے کے طور پر فتح اور حماس کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ آخر کار الفتح سے تعلق رکھنے والے صدر محمود عباس نے اسماعیل ہنیہ کو معزول کر کے ایمرجنسی لگا دی۔

۲۰۱۷ء کے جماعتی الیکشن میں اسماعیل ہنیہ خالد مشعل کی جگہ حماس کے سیاسی ونگ کے صدر مقرر ہوئے۔ آپ اپنی سیاسی و سفارتی سرگرمیوں کے سبب ہمیشہ دشمن کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے یہاں تک کہ امریکی وزارتِ خارجہ نے انھیں دہشت گردی کا ستون قرار دیا۔ ۲۰۱۹ء میں پہلے ترکیہ اور پھر قطر میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ۲۰۲۱ء میں جب اس عہدے کی مدت ختم ہوئی تو رائے شماری کی بنیاد پر آپ اگلے چار سال کے لیے دوبارہ سیاسی ونگ کے سربراہ منتخب ہو گئے۔ طوفان الاقصیٰ سے پہلے اور بالخصوص اس کے بعد آپ نے جرات و بہادری کے ساتھ مصائب کا سامنا کیا اور اپنے موقف سے سرِ مو انحراف نہیں کیا۔

اسماعیل ہنیہ عرصۂ دراز سے اسرائیل کی ہٹ لسٹ پر تھے۔ ان پر متعدّد قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔ آپریشن طوفان الاقصیٰ کے بعد پچھلے سال اکتوبر میں الشاطی میں واقع ان کے گھر پر جہازوں سے بمباری کر کے اسے تباہ کر دیا گیا تھا۔ ۱۰، اپریل ۲۰۲۴ء کو ایک گاڑی پر حملہ کیا گیا جس میں ان کے تین بیٹوں سمیت تین پوتے شہید ہوئے، یہ لوگ عوام کو عید الفطر کی مبارک باد دینے جا رہے تھے۔ اسماعیل ہنیہ کے تین بیٹوں، پوتوں اور

بہن سمیت خاندان کے ستر سے اوپر افراد شہید کیے جا چکے ہیں جب کہ بعض بیانات کے مطابق یہ تعداد اناسی تک جا پہنچتی ہے۔ انھوں نے ان شہادتوں پر ہمیشہ بہادرانہ اور مومنانہ ردِّعمل ظاہر کیا اور کہا: ''شہادتیں ہمیں آزادی کی امید دلاتی ہیں چاہے ہمارے گھر تباہ اور بچے شہید کر دیے جائیں ہم اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹیں گے''۔ جب آپ کے بیٹے اور پوتے شہید ہوئے تو آپ نے فرمایا میرے شہید بیٹوں اور پوتوں کا خون ہمارے دوسرے فلسطینی شہدا کے خون سے افضل نہیں ہے میں اس شرف پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جو میری اولاد کی شہادت کی صورت میں مجھے عطا ہوا ہے''۔

۲۰۱۲ء میں رائٹرز کے ایک صحافی نے آپ سے سوال کیا کہ کیا حماس کے مقاومت سے پیچھے ہٹنے کا کوئی امکان ہے تو انھوں نے قطعی انکار کرتے ہوئے کہا: ''ہرگز نہیں! ہمارا مقابلہ تمام میدانوں میں جاری رہے گا، ملی، سیاسی، ڈپلومیٹک اور عسکری سمیت ہر میدان میں ہم ڈٹے رہیں گے''۔

اسماعیل ہنیہ نے اپنے عمل سے اس بات کو سچ ثابت کر دکھایا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے بارے میں یہ فرمان نازل ہوا ہے: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا﴾ ''انھی ایمان والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچا کر دکھایا۔ پھر ان میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے اپنا نذرانہ پورا کر دیا اور کچھ وہ ہیں جو ابھی انتظار میں ہیں۔ اور انھوں نے (اپنے ارادوں میں) ذرا سی بھی تبدیلی نہیں کی''۔

شیخ احمد یاسین رحمہ اللہ کی شہادت پر ردعمل دیتے ہوئے اسماعیل ہنیہ رحمہ اللہ نے جو خوب صورت الفاظ کہے تھے۔ وہی الفاظ آج ہنیہ اور ان کے دشمن پر صادق آتے ہیں: ''شیخ یاسین تو کب سے منتظر تھے کہ انھیں شہادت ملے البتہ ایریل شیرون نے اپنے لیے جہنم کا دروازہ کھول دیا ہے''۔

* * * * *

مولانا محمد اقبال
معاونِ شعبۂ تحقیق و تصنیف و ترجمہ

قصیدۂ امامِ شافعی رحمہ اللہ

مسلکِ شافعی کے مؤسس حضرت امام محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ قریش کی معروف شاخ بنو ہاشم سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ فلسطین کے مردم خیز علاقے غزہ میں ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے، یہ وہ سال ہے جس میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی وفات ہوئی۔ آپ نے محض سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس کے بعد علم کے حصول میں مشغول ہوئے اور تحصیلِ علم کے سلسلے میں وقت کے ائمہ سے استفادہ کیا۔ آپ نے جن شیوخ سے شرَفِ تلمُّذ پایا، ان میں عالمِ مدینہ حضرت امام مالک، امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہ کے ممتاز شاگرد حضرت امام محمد بن الحسن الشیبانی، مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہ، حضرت عمر بن ابی سلمہ اور حضرت وکیع بن الجراح رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے نام آتے ہیں۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا آپ پر بھرپور اعتماد تھا، ان سے آپ کا تعلق ان کی وفات تک برقرار رہا۔ آپ نے اصولِ فقہ پر عمدہ تصانیف تحریر فرمائیں ان میں ''الرِّسالہ'' اور ''الاُم'' کو بہت قبولیت ملی۔ آپ کے بلند علمی مرتبے کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے ان چار ائمۂ متبوعین میں آپ بھی شامل ہیں، جن کے فقہی مسالک کو قبولیتِ عامّہ نصیب ہوئی۔ آپ کے فقہی مسلک کے پیروکار آج کل مصر، شام، فلسطین، لبنان اور یمن میں موجود ہیں۔ آپ نے ۲۰۴ھ میں مصر میں وفات پائی۔

قصیدے کا پس منظر

امام مُزَنی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی خیریت دریافت کرنے آیا جب کہ وہ

مرض الموت میں مبتلا تھے۔ میں نے ان سے پوچھا: اے ابو عبداللہ کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا: دنیا سے کوچ کرنے کا وقت ہے، دوست و احباب سے جدائی قریب ہے، موت کا جام پینے کی گھڑی آگئی ہے، اعمالِ بد کے انجام سے ملاقات ہونے والی ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ہے۔ پس مجھے نہیں معلوم کہ میری روح جنت کی طرف پرواز کرے گی کہ میں اسے مبارک باد دوں، یا جہنم کی طرف جائے گی کہ میں اس سے تعزیت کروں؟ پھر رونے لگے اور یہ اشعار پڑھنے لگے:[1]

ولمّا قَسا قلبي وضاقتْ مذاهبي جعلتُ الرجا مني لعفوك سُلّما	جب میرا دل سخت ہوگیا اور میری راہیں تنگ ہونے لگیں تو آپ سے عفو کی امید کو میں نے نجات کے لیے سیڑھی بنایا۔
تَعاظَمَني ذنبي فلمّا قَرَنْتُه بعفوك ربي كان عفوُك أعظما	مجھے اپنے گناہ بھاری معلوم ہوئے، لیکن جب میں نے انھیں آپ کی بخشش کے ساتھ ملایا تو آپ کی بخشش ان سے بہت بڑھ کر نظر آئی۔
فما زِلتَ ذا عفو عن الذنب لمْ تزَلْ تجودُ وتعفُوْ مِنّةً وتكَرُّما	آپ ہمیشہ گناہوں کو معاف کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی از راہِ کرم! فیاضی اور عفو و درگزر سے کام لیتے رہیں۔
فإنْ تنتقِمْ مِنّي فلستُ بآيس ولو دخلتْ نفسي بجِرْمي جهَنَّما	اگر آپ مجھ سے انتقام لیں تب بھی میں آپ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں، خواہ میری جان میرے جسم کے ساتھ جہنم میں داخل ہو۔
فلولاك لمْ يَصْمُدْ لإبليسَ عابد فكيف وقد أغوى صَفِيَّك آدما	اگر آپ نہ ہوتے تو کوئی عبادت گزار، شیطان کے سامنے نہ ٹک سکتا، اور کیسے ہوتا؟ جب اس نے آپ کے منتخب حضرتِ آدم کو بھی بہکادیا۔
وإنّيْ لآتي الذَنْبَ أَعرِفُ قدرَه وأعلمُ أنّ اللهَ يَعْفُو تَرَحُّما[2]	میں گناہ کرتا ہوں اسے عظیم جانتے ہوئے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف بھی فرمادیتے ہیں۔

[1] ذہبی، شمس الدین، ابو عبداللہ، محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز (متوفیٰ: ۷۴۸ھ) سیر اعلام النبلاء، ج:۸، ص:۲۶۹، قاہرہ، دار الحدیث: ۱۴۲۷ھ۔ ۲۰۰۶م

[2] یہاں تک چھے اشعار امام ذہبی رحمہ اللہ نے سیر اعلام النبلاء میں ذکر کیے ہیں، اس کے بعد بقیہ اشعار دیوانِ امام شافعی سے لیے گئے ہیں۔

خَفِ اللّٰہَ وَ ارْجُه لكلِّ عظيمة
و لا تُطِعِ النّفْسَ اللَّجُوجَ فتندما

خدا سے ڈر اور ہر بڑی مصیبت میں اس سے امید رکھ، اور گناہوں میں ڈوبے نفس کی پیروی نہ کرتا کہ تجھے بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔

وكنْ بين هاتين مِن الخوفِ و الرَّجا
و أَبشِرْ بعفو الله إنْ كنتَ مُسْلِما

اور خوف اور امید کے درمیان رہ اور خدا کی بخشش سے پُر امید رہ اگر تو مسلمان ہے۔

إليك إلٰهَ الخلقِ أرفعُ رَغْبَتِي
وإن كنتُ يا ذا المنِّ و الجودِ مجرمًا

اے مخلوق کے خدا! میں تجھ سے اپنی مرادوں کی تکمیل کا خواست گار ہوں، اگرچہ میں مجرم ہوں اے احسان اور سخاوت والی ذات!۔

فيا ليت شِعْري هل أصيرُ لِجَنَّةٍ
أُهَنّا و إمَّا للسعيرِ فأنْدَما

کاش مجھے اتنا معلوم ہوتا کہ مجھے جنت جانا ہے تو میں خوشی مناتا، یا (خدانخواستہ) دہکتی ہوئی آگ کی طرف، تو میں ندامت کا اظہار کرتا۔

فَلِلَّهِ دَرُّ العارِفِ النَدْبِ إِنَّهُ
تَفيضُ لِفَرطِ الوَجدِ أَجفانُهُ دَما

اللہ بھلا کرے اس نیک صفت عارف کا، جس کی پلکیں فرطِ جذبات کی وجہ سے خون کے آنسو بہاتی ہیں۔

يُقيمُ إِذا ما اللَيلُ مَدَّ ظَلامَهُ
عَلى نَفسِهِ مَن شِدَّةِ الخَوفِ مَأتَما

جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے تو وہ عارف کھڑا ہو جاتا ہے اور شدتِ خوف کی وجہ سے اپنے اوپر ماتم کرتا ہے۔

فَصيحـًا إِذا ما كانَ في ذِكرِ رَبِّهِ
وَفي ما سِواهُ في الوَرى كانَ أَعجَما

جب وہ اپنے رب کا ذکر کرتا ہے تو بڑا فصیح اللسان بن جاتا ہے، اور ماسوی اللہ کی تعریف میں گونگا ہو جاتا ہے۔

وَيَذكُرُ أَيّامـًا مَضَت مِن شَبابِهِ
وَما كانَ فيها بِالجَهالَةِ أَجرَما

وہ اپنی جوانی کے وہ دن یاد کرتا ہے، جب وہ جہالت کے سبب گناہ کیا کرتا تھا۔

فَصارَ قَرينَ الهَمِّ طولَ نَهارِهِ
أَخا السُهدِ وَ النَجوى إِذا اللَيلُ أَظلَما

وہ دن بھر گناہوں کے سبب غمگین رہتا ہے، اور جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے تو اسے بیداری اور سرگوشی میں گزارتا ہے۔

يَقولُ حَبيبي أَنتَ سُؤلي وَبُغيَتي
كَفى بِكَ لِلراجينَ سُؤلاً وَمَغنَما

وہ کہتا ہے: میرے محبوب! آپ ہی میری مراد اور منتہائے مقصود ہیں، امیدوالوں کے لیے آپ ہی کی ذات مدد کے لیے کافی ہے۔

أَلَستَ الَّذي غَذَّيتَني وَهَدَيتَني
وَلا زِلتَ مَنّانًا عَلَيَّ وَمُنعِما

کیا آپ کی ذات وہ نہیں ہے جس نے میری پرورش کی اور میری رہنمائی کی؟ اور کیا آپ کا مجھ پر احسان وانعام مسلسل نہیں ہے؟

عَسى مَن لَهُ الإِحسانُ يَغفِرُ زَلَّتي
وَ يَستُرُ أَوزاري وَ ما قَد تَقَدَّما

امید ہے کہ وہ ذات جس کا احسان ہے وہ میری خطاؤں کو معاف کردے، اور میرے گناہوں پر اپنی رحمت سے پردہ ڈال دے۔

تعاظَمَني ذَنْبِي فأقبلتُ خاشِعًا
ولولا الرِّضَا ما كنتَ يا ربِّ مُنعما

مجھ پر میرے گناہوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا تو میں سر جھکائے چلا آیا، اے رب! اگر آپ کی رضا نہ ہوتی تو بندوں پر آپ کا انعام کیسے ہوتا۔

فإن تعفُ عني تَعْفُ عن مُتَمَرّدٍ
ظلُومٍ غَشُومٍ لا يزايلُ مأثما

اگر آپ مجھے معاف کر دیں گے تو آپ ایک سرکش، ظالم شخص کو معاف کردیں گے جو پوری زندگی گناہوں میں پڑا رہا۔

فجرُمي عظيمٌ من قديمٍ وحادثٍ
وعفوُك يأتي العبدَ أعْلَى وأجْسَمَا

میرے نئے اور پرانے گناہ بہت بڑے ہیں، اور آپ کی بخشش بندے کے پاس اس سے بڑھ کر پہنچتی ہے۔

حَوَاليَّ فضلُ اللهِ من كلِّ جانبٍ
ونورٌ من الرحمٰنِ يفترِشُ السَّمَا

مجھے چاروں طرف سے خدا کے فضل نے ڈھانپ لیا ہے اور رحمٰن کا نور آسمان تک پھیلا ہوا ہے۔

وفي القَلْبِ إشراقُ المحبِّ بوصْلهِ
إذا قاربَ البُشْرى وجازَ إلى الحِمَى

اور دل میں محبوب کے وصل کی روشنی طلوع ہو رہی ہے، خوش خبری اور حرم میں داخل ہونے کا وقت قریب ہے۔

حواليَّ إيناسٌ من اللهِ وحدَهُ يطالِعُني في ظلمةِ القبرِ أنجُما	میں اپنے ارد گرد اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ کی اُنسیت محسوس کر رہا ہوں، جو قبر کے اندھیرے میں ستاروں کی طرح میرے اوپر طلوع ہو رہی ہے۔
أصونُ وِدَادِي أن يُدَنِّسَه الهَوَى وأحفظُ عهدَ الحبِّ أن يَتَثَلَّمَا	میں اپنے اس تعلق کو خواہشاتِ نفسانی کے میل کچیل سے بچاؤں گا، اور عہدِ محبت کو کسی صورت ٹوٹنے نہیں دوں گا۔
ففي يَقْظَتِي شوقٌ وفي غَفْوَتي مُنًى تلاحِقُ خَطْوِي نشوةً وترنُّما	بیداری میں اشتیاق اور غفلت میں آرزو میرے ساتھ جوش و خروش اور ترنم کی کیفیت میں چلتے ہیں۔
ومن يَعْتَصِمْ باللهِ يسْلَمْ من الوَرَى ومن يرجُه هيهاتَ أن يتندَّما	اور جو خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے وہ مخلوق سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اور جو اس کی ذات سے امید وابستہ کرتا ہے وہ کبھی اس پر پشیمان نہیں ہوتا۔

✲ ✲ ✲ ✲ ✲

مولانا معراج محمد
رکنِ مجلسِ مشاورت، ماہ نامہ مفاہیم، کراچی

الحاد اور مذہب کی بحث

سوشل میڈیا اور خصوصًا فیس بک پر ہمارے پختون بھائیوں میں الحاد کی بحث جاری ہے، مگر یہ صرف پختونوں کا نہیں، پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔ مغرب سب سے زیادہ اس مسئلے کا شکار ہے اور وہاں جو چیز چل جائے باقی دنیا میں اس کی شہرت اور رواج کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ الحاد یا ایتھی ازم کی تاریخ بھی کوئی نئی نہیں، بلکہ دوسری گمراہیوں کی طرح صدیوں پرانی ہے۔ مگر یہ ایک شاذ اور غیر معقول نظریہ سمجھا جاتا تھا۔ دورِ جدید میں خواہشات کی بے بہا فراوانی اور ریاستی بلکہ بین الاقوامی سطح پر سرپرستی نے اسے فروغ دیا اور اسے پوری دنیا میں پھیلانے میں جدید ذرائعِ ابلاغ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ گذشتہ صدی میں بھی سوویَت یونین اور سرخ انقلاب کی سرپرستی میں الحاد کافی مشہور ہوا تھا مگر ذرائعِ ابلاغ کی حالیہ فراوانی نہ ہونے کی وجہ سے عام آدمی اس سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا، بس کالج، یونیورسٹیوں کے کچھ طلبہ اور بعض قوم پرست اس کی زد میں آئے تھے۔ اس وقت سوویَت یونین میں الحاد کا طوطی اس زور سے بول رہا تھا کہ ستر کی دہائی میں جب علامہ محمد اسد (مصنفِ ”طوفان سے ساحل تک“) وہاں گئے تو سڑکوں پر بینر لگے ہوئے تھے جس میں علامتی طور پر خدا کو بلندیوں سے گرایا ہوا دکھایا گیا تھا۔ (نعوذ باللہ) گذشتہ صدی میں بہت سے پڑھے لکھے مغربی لوگوں کا خیال تھا کہ بیسویں صدی کی نصف آخر تک دنیا سے مذہب کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بدنامِ زمانہ عالمی ملحد رچرڈ ڈاکنز کی تصنیف The God Delusion کے رد میں Alister McGrath نے کتاب لکھی The Dawkins Delusion، وہ کہتے ہیں کہ میں ملحد تھا اور بے چینی سے منتظر تھا کہ ساٹھ کی دہائی کے خاتمے تک دنیا سے مذہب کا صفایا ہو جائے گا اور دنیا بغیر خدا کے ایک آزاد دنیا بن جائے گی۔ مگر ساٹھ کی دہائی کا آنا تھا کہ مشرق و

مغرب میں مذہبی تحریکیں اس زور سے اٹھیں کہ ماضی میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ امریکہ کے ایک بڑے ماہرِ سماجیات پیٹر برگر نے The Desecularization of the World ایک بہترین مقالہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیکیولرازم جس جوش و خروش سے نمودار ہوا تھا مذہب نے اس کے جذبے کو مدھم کر کے اس میں بہت سی اصلاحات کر دی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ سیکیولرازم نے مذہب پر بھی اثرات مرتب کیے ہیں مگر جس دعوے کے ساتھ اس کا آغاز ہوا تھا اس میں مکمل طور پر ناکامی نظر آتی ہے۔ انھوں نے امریکہ، مصر، ایران، سعودی عرب اور برِصغیر میں مذہبی تحریکوں کا جائزہ لے کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دنیا سے مذہب کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور سیکیولرازم کو اس کے ساتھ سمجھوتہ کر کے گزارا کرنا ہوگا۔

اگر موجودہ حالات میں ملکی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو چند سال پہلے جب غامدی صاحب کا جوابی بیانیہ سامنے آیا، تو ہر کوئی ان کی زبان بول رہا تھا، کیا پالیسی ساز ادارے اور کیا دانش ور اور کیا نشریاتی ادارے، ہر جگہ اس کی گونج سنائی دیتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گویا اب ملک میں مذہب کے نام پر کسی بڑی سرگرمی کی گنجائش ختم ہوگئی ہے۔ نائن الیون کے بعد دنیا کے حالات بھی کچھ اس طرح کا منظر پیش کر رہے تھے۔ مگر زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ علامہ خادم حسین رضوی نے خالص مذہبی مسئلے پر ملکی سطح پر غیر معمولی تحریک برپا کی، نیز جمعیتِ علماے اسلام اور مولانا فضل الرحمٰن نے ملکی سیاست میں ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل کر لی اور اب تک مولانا فضل الرحمٰن پورے قومی سیاسی منظرنامے پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان جماعتوں کا مقام بوجوہ یہ نہیں کہ یہ ملک کا نظام بدل سکیں، مگر یہ بھی ضرور ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے مذہب کے خلاف علانیہ کارروائی ایک دشوار ہدف ہے۔ ماضی میں قراردادِ مقاصد اور آئین سے اسلامی دفعات اور توہینِ رسالت کے قانون کے خاتمے کی کوششوں کی ناکامی اس پر دال ہیں۔

عالمی سطح پر دیکھا جائے تو امریکہ سمیت یورپی ممالک میں دائیں بازو کی جماعتوں کو نمایاں کامیابی ملی ہے اور بعض ملکوں میں تو ان کی حکومت بنتے بنتے بچی ہے جیسا کہ فرانس اور جرمنی میں ہوا۔ پڑوس کے ملک بھارت میں سیکیولرازم خطرے میں ہے، عملاً تو وہ ہندو دھرم کا ملک بن چکا ہے مگر آئینی طور پر بھی اس کے

قریب ہے۔ مودی صاحب نے اسی نعرے کے ساتھ انتخابی مہم چلائی اور اس کے باوجود وہ تیسری بار حکومت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ اس ترمیم سے فی الحال دور ہیں مگر اس نعرے کے ساتھ اتنا ووٹ حاصل کرنا کہ اور حکومت بنانا معمولی بات نہیں ہے۔

مشرق وسطیٰ میں توگیم کا مرکزی محور مذہب اور مذہبی لوگ ہیں اسی طرح فلسطین کے معرکے نے مذہب کی اخلاقی اور عملی صلاحیت کو دنیا پر آشکار کردیا ہے۔ ترکی کا سو سال تک سیکولرازم آزمانے کے بعد مذہب کی طرف واپسی اور ایران اور افغانستان میں مذہب کی فیصلہ کن حیثیت یہ سب کچھ اس بات کا تاریخی اور بین ثبوت ہیں کہ جو لوگ مذہب کے خاتمے کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ ایسا خواب دیکھ رہے ہیں، جس کی کوئی تعبیر نہیں اور ایسے لوگ ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔

*****

ڈاکٹر محمد رشید ارشد
مدیر غزالی فورم

ہمارے عقائد پر جدید تعلیم کے اثرات

قسط نمبر ۲

تعلیم کی روایتی تعریف

تعلیم وہ عمل ہے جو آپ کو اپنے بڑوں سے ورثے اور ترکے میں ملا ہے، اس ترکے کو اپنی اگلی نسلوں تک پہنچانے کا جو عمل ہوتا ہے اسے عام طور پر تعلیم کہا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ استناد کے ساتھ چلتا ہے، یعنی لوگوں نے اپنے وقت کے بڑوں سے سیکھا، پھر اسے آگے سکھایا اور یوں یہ سلسلہ آگے چلتا چلا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافے بھی ہوتے چلے گئے اور یہ طریق اب تک جاری ہے، اسے تعلیم کہتے ہیں۔ ہمارے یہاں تعلیم کا تصور یہ ہے کہ یہ ایک اخلاقی عمل ہے، اور اس کا انسان کی تشکیل میں بہت بڑا کردار ہے۔ اِتحاف السادۃ المتقین میں حضرت حسنِ بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل ہوا ہے: لَوْلَا الْعُلَمَاءُ لَصَارَ النَّاسُ مِثْلَ الْبَهَائِمِ. ''اگر علما نہ ہوتے تو لوگ چوپایوں کی طرح ہوتے''۔ اقبال نے کہا تھا کہ:

گمان آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قِندیلِ رہبانی

پہلے زمانوں میں یہ جملہ کہا جاتا تھا: Everything is moral an education is basically a moral, ethical activity ''ہر چیز اخلاقی ہے اور تعلیم بنیادی طور پر ایک اخلاقی سرگرمی ہے''۔

ماڈرن تصورِ تعلیم

تعلیم کا جدید تصور یہ ہے کہ: Everything is political ''سب کچھ سیاسی ہے''۔ حالانکہ سیاست اخلاق کا ایک جزو تھا۔ اگر آپ تہذیب الاخلاق پر ابنِ حزم، ابنِ مسکویہ یا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم کی کتابیں پڑھیں، تو سب سے پہلے نفس، پھر تدبیرِ منزل، پھر سماج اور اس کے بعد سیاستِ مدن کا موضوع آتا ہے۔ یعنی تہذیب الاخلاق کا ایک ہی محل ہے جس سے ہوتے ہوتے آپ ادھر تک پہنچ گئے۔ چنانچہ ہر چیز پہلے اخلاقی تھی اب ہر چیز سیاسی ہے اور جدید معنوں میں سیاسی ہے۔ یعنی سقراط، سینٹ آگسٹائن اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے معنوں میں نہیں بلکہ مکیاولی کے معنوں میں۔ مکیاولی نے کہا تھا: The politics is basically A moral یعنی سیاست پر اخلاقیات کے ضوابط عائد نہیں ہوتے۔ مثلاً لیڈر بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں کہ یہ کریں گے وہ کریں گے، پھر وہ اپنے وعدوں سے پھر جاتے ہیں۔ جب آپ ان سے پوچھیں کہ آپ نے اپنے وعدوں پر عمل کیوں نہیں کیا؟ آپ نے جھوٹ بولا تھا؟ وہ کہیں گے کہ نہیں نہیں، اس چیز پر جھوٹ سچ کا اطلاق نہیں ہوتا، وہ ایک سیاسی بیان تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اے مورل ہے یعنی وہاں پر موریلٹی کا اطلاق نہیں ہوتا۔

روایتی تصورِ تعلیم اور جدید تصورِ تعلیم میں فرق

روایتی تعلیم ایک اخلاقی عمل تھا، جدید تعلیم ایک سیاسی فیصلہ ہے۔ اگر دونوں کا تقابل کیا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ روایتی علم اور تعلیم اقداری تھا اور جدید علم و تعلیم اقتداری ہے۔ پہلے اخلاقی تھا اور اب طاقت کی بنیاد پر ہے۔ ہمارے علم اور تعلیم کا مقصود بندگی تھا، اگر کسی کو جوتا گانٹھنے یا کپڑے بُننے کا علم سکھایا جارہا ہے تو وہ بھی بندگی کے پیراڈائم میں ہے۔ ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ایک بات منسوب ہے، وہ کہتے ہیں: ''ہمارے علوم متعدّد ہیں اور ہمارا معلوم واحد ہے''۔ یعنی ہم تفسیر پڑھیں، حدیث پڑھیں، فقہ پڑھیں اور ہم چارپائی بننے کا علم سیکھیں تو اس میں بھی ہمارا مقصود اللہ ہے۔ اب جدید تعلیم خدا سے باغی کرنے کا ایک مکینزم ہے، آپ کو معاذ اللہ! خدا سے آزادی حاصل کرنی ہے۔ اکبر نے کہا تھا:

اک علم تو ہے بت بننے کا، اک علم ہے حق پر مٹنے کا
اُس علم کی سب دیتے ہیں سند، اِس علم میں ماہر کون کرے؟

جدید تعلیم اپنی ساخت میں بت بنانے کا عمل ہے، بے شک آپ اس میں دینیات وغیرہ داخل کر دیں اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، کیونکہ یہ اپنے جوہر میں بت بنانے کا عمل ہے۔

جدید تعلیم کے نتائج

پچھلے چند سالوں میں کھمبیوں کی طرح موٹیویشنل اسپیکر ابھرے اور جگہ جگہ انھوں نے نوٹنکی لگائی۔ ان سب نے صبح شام تحریر و تقریر میں یہی جگالی کی کہ جناب آپ ہی سب کچھ ہیں، آپ سب کچھ کر سکتے ہیں، آپ کے راستے میں سوائے آپ کی ذات کے، کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ جب طلبہ اس تصور کے ساتھ عملی میدان میں اترتے ہیں اور مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر پاتے تو مایوسی اور احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں، انھیں لگتا ہے کہ شاید وہ بالکل ناکارہ ہیں، پھر اس طرح کے جملے تو انھیں بالکل معطل کر دیتے ہیں مثلاً ''اگر آپ غریب پیدا ہوئے تو آپ کا قصور نہیں لیکن آپ غریب مر جاتے ہیں تو آپ ہی قصور وار ہیں''۔ ان موٹیویشنل اسپیکرز سے ہٹ کر فلسفے کی دنیا میں آپ غور کریں تو ہر دور میں کوئی نہ کوئی ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جو فیشن میں ہوتا ہے اور ہمارے ہاں جو لوگ دین سے بھاگنا چاہتے ہیں وہ اس کی کتابیں لے کر گھوم رہے ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں کارل مارکس تھا، پھر Bertrand Russell تھا، پھر اس کے بعد اکیسویں صدی کے شروع میں نیو ایتھیزم میں Richard Dawkins تھا، اور گذشتہ کچھ عرصے سے Yuval Noah Harari ہے۔ اس نے Sapiens: A Brief History of Humankind کے نام سے پوری انسانیت کی تاریخ لکھ دی ہے۔ اس نے یہ بتایا کہ مستقبل کا انسان کون ہوگا اور اس نے یہ بھی بتایا کہ انسان خدا بننے جا رہا ہے، یعنی اس نے تصور دیا ہے کہ ہم نے خدا کو معاذاللہ! ذبح کر دیا ہے، اب ہم سب کو چھوٹا موٹا خدا بننا ہے۔ اور اس نے کہا کہ سارے انسان تو خدا نہیں بنیں گے، البتہ ایک ماسٹر کلاس بنے گی۔ Adam Smith نے اپنی کتاب میں ایک Masters of Mankind (بنی نوع انسان کے ماسٹرز) استعمال کی اصطلاح تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ وہ

لوگ ہیں جو کہتے ہیں سب کچھ ہمارا ہو، ہمارے علاوہ کسی کا کچھ نہ ہو۔

غور کریں تو یہ سب باتیں خوفناک ہیں، لیکن ایک مسلمان کے لیے ایک بات بہرکیف اطمینان بخش ہے، وہ یہ کہ الحمدللہ وہ ایک پورے اعتماد کی جگہ یعنی وحی کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ انسان کہیں نہیں جا رہا، ان معنوں میں کہ انسان مسجودِ ملائک ہے، اللہ کا بندہ ہے، زمین کا دولہا ہے، یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ان انسانوں میں اللہ کی کتاب کے وارث بھی ہیں، تو گویا جیسے ہمارے لیے ایک سہولت ہوگئی ہے کہ اگر ہم اپنے دین سے جڑے رہیں گے، بچ جائیں گے۔ John Taylor Gatto کی بہت مشہور کتاب ہے Weapons of Mass Instruction، اس کے شروع میں وہ ایک مفکر Alexander Inglis جن کے نام پر ہاورڈ میں ایک لیکچر سیریز بھی ہے، ان کے حوالے سے بتاتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں کتاب Principles Of Secondary Education لکھی۔ اس میں انھوں نے چھے نکات بتائے کہ ماڈرن ایجوکیشن کے مقاصد کیا ہیں۔ اس میں ایک اہم نکتہ یہ ہے: Adjustive or adaptive function یعنی ایجوکیشن کا ایک فنکشن ہے کہ آپ کو خاص طرح کے لوگ پیدا کرنے ہیں، جو خاص طرح سے اتھارٹی کے تابعِ فرمان بن جائیں۔ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جب مالٹا سے آزاد ہوئے تھے، تو اس وقت جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، اس موقعے پر انھوں نے جو خطبہ دیا اس کا ایک جملہ ملاحظہ کیجیے: ''ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں پر غلام پیدا کرتے رہیں''۔ یعنی جدید تعلیم کا مقصد ہے کہ کیپٹل ازم کے امپائر کے لیے سستے مستری پیدا کرنا۔ آپ کا وہ بچہ جو سرکاری اسکولوں سے پڑھتا ہے، وہ کیپٹل ازم کا کل پرزہ بنے گا۔ جو برائٹ بچہ ہے وہ یہاں کی ملٹی نیشنلز کا نوکر بنے گا، زیادہ ترقی کرے گا تو گوگل یا مائیکروسافٹ کے ہیڈ آفس میں پہنچ جائے گا، یہ اس کی معراج ہے۔ اور کرے گا کیا؟ دجل اور ظلم پر مبنی عالمی نظام کا ایک انتہائی ادنیٰ کل پرزہ بن جائے گا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ بڑے تعلیمی اداروں لمز اور آئی بی اے وغیرہ کے بچے بڑے برائٹ بچے ہوتے ہیں، وہ کیا کرتے ہیں؟ ان بے چاروں کے متعلق اکبر نے کہا تھا:

سند مجھ کو ملی تو جل کے کہنے لگے واعظ
خری کی ہو گئی تکمیل باقی صرف لدنا ہے

یعنی آپ کو جو سند ملی ہے یہ در حقیقت آپ کا کھوتا پن مکمل ہو گیا ہے، یہ خری ہے اور خری اسی کو کہتے ہیں، لہذا خری کی تکمیل ہو گئی باقی صرف لدنا ہے۔ لدنا کیا ہے، آپ کو جاب ہینڈلنگ کرنی ہے اور اس سسٹم میں لدو اونٹ کی طرح ضم ہونا ہے، بس یہ جدید تعلیم ہے۔ ہمارے ہاں یہ تبدیلی استعمار کے ذریعے آئی، اور اگر ہم استعمار کے تحت نہ بھی آتے تب بھی بچنا ممکن نہ تھا، سوڈیڑھ سو سال بعد ہمیں یہ سب کرنا پڑتا۔ ایسا نہیں ہے کہ استعمار نہ آتا تو ہم اپنی جگہ پر قائم رہتے۔ اگرچہ زیادہ تر عالمِ اسلام جبراً تبدیل ہوا اور جدیدیت کی راہ پر لگا، لیکن کچھ جگہوں پر یہ جدیدیت در آمد بھی کی گئی، مثلاً سلطنتِ عثمانیہ تو استعمار کے قبضے میں نہیں گئی، پھر بھی وہاں تبدیلی آئی۔ لہذا اس تبدیلی میں مغرب کے نظامِ تعلیم کا بڑا ہاتھ تھا، اور اب تک مغرب کا تصورِ علم ہم پر مسلط ہے، اور اس کے نتائجِ بد کا ہم سامنا کر رہے ہیں۔

سوال و جواب

سوال: جدید تعلیم نے ہمارے عقائد کو کیسے متاثر کیا؟

جوال: جدید تعلیم کا ہمارے عقائد پر جو اثر پڑا ہے اُس کا بنیادی سبب جدید علم کی ساخت ہے۔ جدید علم حواس مرکز ہے، شہود مرکز ہے، اُس میں غیب کے لیے گنجائش نہیں ہے، اسی لیے ہمارے ہاں عام طور پر جب بھی اسلامک ایجوکیشن کی یا اسلامک اسکولنگ کی بات ہوتی ہے تو زیادہ تر گفتگو نصاب پر ہوتی ہے کہ نصاب میں کچھ بہتری لائی جائے اور اُس میں دینیات کا پہلو بڑھا دیا جائے۔ مثلاً سائنسز چاہے وہ فزیکل ہوں یا سوشل، عمومی خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ تو واقعاتی ہیں اور matter of fact ہیں اور اُس میں کچھ چیزیں شامل کر دی جائیں تو کام بن سکتا ہے۔ لیکن جس کو آپ matter of fact کہہ رہے ہیں، اُس میں بہت سے مسئلے ہیں، پھر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ religion and science میں کوئی conflict نہیں ہو سکتا، مولانا عبد الباری ندوی صاحب نے بہت پہلے ایک کتاب لکھی تھی "مذہب اور سائنس"، اُنھوں نے ایک تشبیہ بیان کی تھی کہ مذہب اور

سائنس میں تصادم کا مطلب ایسے ہی ہے جیسے بحری جہاز اور ٹرین میں ٹکر ہو جائے یا مثال کے طور پہ ہوائی جہاز اور سائیکل میں ٹکر ہو جائے۔ گویا دونوں کے دائرے بالکل الگ الگ ہیں۔ لیکن میری ناقص رائے میں content سے زیادہ اہم جدید تعلیمی اسٹرکچر ہے۔ وہ اسٹرکچر آپ کو گائیڈ کرتا ہے۔ ہم ایک جملہ طالبِ علموں سے کہتے ہیں اور وہ جملہ اگر ہماری سمجھ میں آجائے تو جدید دنیا کی بہت سی چیزیں ہم پر کھل جائیں گی، وہ جملہ مارشل مکلوہن کا ہے اور بڑا سادہ سا لیکن گہرا جملہ ہے، اُس نے کہا تھا: The medium is the message۔ جس ذریعے سے آپ کوئی چیز ڈیلیور کر رہے ہیں یا حاصل کر رہے ہیں، وہ ذریعہ بہت اہم ہے۔ مثلاً آپ کہیں کہ جدید دور میں دورۂ حدیث شریف منعقد ہونا ہے تو ہمارے علما جدید کیوں نہیں ہو رہے؟ وہاں یہ جدید ٹیکنالوجی کیوں نہیں استعمال ہو رہی؟ پروجیکٹر کیوں نہیں استعمال کرتے؟ پاور پوائنٹ پر حدیثوں کا تجزیہ آنا چاہیے، علیٰ ہٰذا القیاس۔ تو بات یہ ہے کہ آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ حدیث کا علم اِس اسٹرکچر کے ساتھ کنڈیوسو نہیں ہے، اُس علم میں تو میز کرسی بھی مسئلہ بنے گی۔ ہر علم کو حاصل کرنے کا ایک پروٹوکول ہے، ایک طریقہ ہے، ہر میڈیم ہر علم کے لیے کنڈیوسو نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامک اسکولز کا تصور ہے، اسکولز ہیں، کالجز ہیں، پھر یونی ورسٹیز ہیں، آپ اس میں زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ کچھ دعائیں ڈال دیں، تھوڑے بہت اذکار اور کلمے یاد کرا دیے، آداب رٹوا دیے، ویلنٹائنز ڈے نہیں منایا جائے گا، ہیلووین نہیں منائی جائی گی، خواتین اساتذہ ڈھنگ کا لباس پہنیں گی، کیا اچھی بات ہے۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ آپ نے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو تعلیم دینی ہے، اِس بات پر کیوں سوال نہیں اٹھتے کہ لڑکیوں اور لڑکوں کا نصاب ایک کیوں ہے؟

سوال: بظاہر روایتی تعلیمی نظام میں عورت کو دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع نہیں تھے لیکن اب جیسے عورتوں کو آگے بڑھنے کے مواقع دیے جاتے ہیں، اِس معاملے میں ہمارا کیا نقطۂ نظر ہونا چاہیے؟

جواب: آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ بچیوں کو تو رہنے دیں، ہمارے بچوں کو بھی یہ تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہیے، یہاں بھی ہمیں اکبر یاد آتے ہیں، اُنھوں نے کہا تھا:

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو
تعلیمِ دختراں سے یہ امید ہے ضرور
کہ ناچے دلھن خود ہی اپنی برات میں

اور یہ بات تو ہمارے مشاہدے کی ہے، ہم نے کچھ ایسے اداروں میں پڑھایا ہے جو بہت ٹیڑھے میڑھے ہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں، وہاں جو بچیاں پڑھتی ہیں، اُن کو دیکھ کر ہی یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بیوی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ اِن میں تسلیم کی صفت ہے ہی نہیں، انھیں تو قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے، آپ دیکھ نہیں رہے کہ لاکھوں کروڑوں لگا کر شادیاں ہوتی ہیں، کوئی ہفتے چل رہی ہے، کوئی مہینے چل رہی ہے، وجہ یہ ہے کہ ازدواجی رشتہ ایسے مزاج کے ساتھ نہیں چلتا۔

سوال: آپ نے سائنس کے حوالے سے بات کی، میں خود سائنس کا استاد ہوں، عموماً فلسفے کے اساتذہ سائنس سے ناواقف ہوتے ہیں اس لیے وہ یہ بات ضرور کرتے ہیں کہ سائنس مذہب سے دور کرتی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سائنس تو مذہب سے قریب کرتی ہے۔ یعنی جتنی سائنس قرآن میں بیان کی گئی ہے دوسری جگہ نہیں ہے، صرف ریلیٹ کرنے کی ضرورت ہے اور ہمارے دینی اساتذۂ کرام ناواقفیت کی وجہ سے اُس کو ریلیٹ نہیں کر پاتے۔

جواب: دیکھیے بات یہ ہے کہ ایک ہے پاپولر سائنس جو ہمارے ہاں بیان ہوتی ہے، اور ایک ہے سائنس کی تھیوری، سائنس کی ایک تعریف جو عرصے سے چلی آرہی ہے وہ ویریفیکیشن ہے، تجربے کے ذریعے جس چیز کی ویریفیکیشن ہو جائے وہ سائنس سے ثابت ہے۔ کارل پوپر وغیرہ کے بعد اب تعریف یہ ہو گئی کہ فالسیفیکیشن سائنس کی بنیاد ہے، جو چیز فالسیفائی ہو سکے وہ سائنس ہونا کوالیفائی کرتی ہے۔ چنانچہ خدا، آخرت، فرشتے، روح، جنت، جہنم یہ نان فالسیفائی ایبل ہیں، اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سائنٹفک نہیں ہیں تو ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ آج ایک تھیوری آئی ہے، وہ کسی مذہبی چیز کا اثبات کر رہی ہے، ہو سکتا ہے کل وہ بدل جائے۔ نیوٹن

کی فزکس اور تھی، آئن سٹائن کی اور ہے، آئزن برگ کی اور ہے، اب ہم اگر اِس میں پڑ جائیں کہ سائنس کی جو نئی تحقیقات سامنے آئیں، ہم اُن کو کہیں کہ دیکھیں قرآنِ مجید میں اِس کا بیان ہے اور تیس چالیس سال بعد وہ تھیوری فالسیفائی ہو جائے، پھر ہم خالی ہاتھ بیٹھے رہیں، یہ بہت سلپری سلوپ ہے۔ religion and science یا Quran and science بہت حساس موضوع ہے، ہم بہت سی چیزوں کو بہت جلدی قبول کر کے اُس کی مرعوبیت میں آ کر اللہ کی کتاب سے اُس کو ریلیٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اِس سے ہمارا مذاق اڑتا ہے اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں سائنسدان محنتیں کر کر کے، سر مار مار کے کوئی چیز دریافت کرتے ہیں، یہ مولوی آرام سے بیٹھ کر کہتے ہیں کہ یہ تو قرآن میں پہلے سے ہی تھا۔ اگر پہلے سے ہی تھا تو آپ کس خوابِ غفلت میں تھے؟ آپ کیوں نہیں برآمد کر سکے؟ قرآن تو آپ کے پاس تھا۔ لہذا اِس میں تھوڑی سی احتیاط کرنی چاہیے۔

*****

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ

قسط نمبر ۲۹

مارچ ۱۹۴۶ء میں مسئلۂ فلسطین کے "حل" کے لیے قائم کی گئی اینگلو امریکی کمیٹی کا دوسرا اجلاس "لوزان" کے مقام پر ہوا تھا جس میں ۱۹۳۹ء میں جاری ہونے والے وائٹ پیپر کی سفارشات کو ختم کرنے سمیت بہت سے یہودی مفادات کا تحفظ کیا گیا تھا۔ ان اقدامات میں اصل کردار امریکہ کا تھا۔ امریکی صدر ہیری ایس ٹرومین نے اعلامیہ جاری ہونے والے دن ہی اس کے قبول و تحسین کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت برطانیہ نے اپنے تئیں ان اقدامات کی مخالفت کی تھی۔ وزیرِ اعظم کلیمنٹ ایٹلی بالخصوص وائٹ پیپر کے خاتمے کا مخالف تھا۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی حمایت نہیں تھی بلکہ یہودیوں کی سرکشی تھی کہ وہ برطانوی افواج اور دیگر محکموں پر حملے کرنے سے نہ چوکتے تھے اور برطانوی مفادات اور املاک پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔

برطانوی وزیرِ اعظم کی اس مخالفت کے اظہار پر یہودیوں نے دہشت گردی کی وارداتیں تیز کر دیں۔ جون ۱۹۴۶ء میں یہودیوں نے مختلف علاقوں میں آٹھ پل اڑا دیے۔ اس کے علاوہ کئی مقامات پر ریلوے ٹریک اکھاڑے گئے اور ورکشاپس پر حملے کیے گئے۔ اسی دوران پانچ برطانوی فوجی عہدے داروں کو اغوا کیا گیا۔ جن میں سے دو کے لیے موت کی سزا کا اعلان کیا گیا لیکن بعد میں اس سزا کو موخر کیا گیا جس کے سبب فوجی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ برطانوی افواج کی طرف سے دہشت گردی میں ملوث کئی افراد کو گرفتار کیا گیا۔ وزیرِ اعظم ایٹلی نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ چند مہینوں میں ہمارے سولہ فوجی اور کئی پولیس

والے مارے جا چکے ہیں۔ دوسری طرف اعلامیہ مسلمانوں پر بجلی بن کر گرا۔ کئی ملکوں میں احتجاج اور مظاہرے کیے گئے، کئی ممالک کی پارلیمنٹ میں مذمتی قرار دادیں منظور کی گئیں اور مغربی طاقتوں کے سامنے بھی صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی اس پر صدائے احتجاج بلند کی اور قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اس اعلامیے کو خیانتِ کبریٰ قرار دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے سوویَت اتحاد کے ساتھ ربط و ضبط قائم کرنے کی آوازیں بھی بلند ہونے لگیں اور امریکہ اور برطانیہ سے اظہارِ مایوسی کیا گیا۔

مئی ۱۹۴۶ء میں چند عرب ملکوں نے امریکہ کا سفر کیا اور نائب وزیرِ خارجہ ڈین ایچی سن سے ملاقات کر کے احتجاج ریکارڈ کرایا۔ نائب وزیرِ خارجہ نے مسلمانوں کو یقین دہانی کرائی کہ لوزان کی سفارشات پر عمل در آمد سے پہلے مسلمانوں سے مشاورت کر کے انھیں اعتماد میں لیا جائے گا۔ اس کے لیے مسلمان اور یہودی راہنماؤں کے ساتھ مشاورت کا اہتمام کیا جائے گا۔ اسی دوران برطانیہ نے بھی اعلان کیا کہ وہ عن قریب امریکی حکومت، یہودی اور عرب راہنماؤں کے ساتھ مشاورت کر کے کوئی اعلامیہ جاری کرے گا۔ ۲۸ اور ۲۹ مئی ۱۹۴۶ء کو عرب راہنماؤں کی ایک کانفرنس کا انعقاد مصر میں ہوا۔ اس کانفرنس کے داعی شاہِ مصر الملک فاروق الاول تھے جب کہ سعودی ولی عہد امیر سعود بن عبد العزیز، شاہِ اردن الملک عبد اللہ بن حسین بن علی الہاشمی، امیرِ مملکتِ ہاشمیہ عراقیہ امیر عبد اللہ بن علی الہاشمی، یمن سے امیر سیف الاسلام عبد اللہ حمید الدین، رئیسِ جمہوریۂ لبنان بشارہ الخوری اور رئیسِ مملکتِ شام شُکری القوتلی شریک تھے۔

کانفرنس کے اعلامیے میں کہا گیا کہ فلسطین ایک عرب علاقہ بلکہ عرب کا دل ہے لہٰذا اس کے تحفظ کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائے جائیں گے۔ کانفرنس نے امریکہ اور برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ اپنے وعدوں کے مطابق فلسطینیوں کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے وطنی حکومت کا قیام عمل میں لائیں۔ یہودیوں کی ہجرت پر پابندی کے ساتھ ساتھ یہودی دہشت گرد تنظیموں کو غیر مسلح کیا جائے اور یہودیوں کی طرف سے دوسرے ملکوں میں فلسطینیوں کی معاشی ناکہ بندی کے لیے قائم کیے گئے دفاتر ختم کیے جائیں۔ کانفرنس میں عرب قوموں سے اپیل کی گئی کہ وہ رضاکارانہ طور پر مال اسلحہ و مجاہدین کے ذریعے سے اہلِ فلسطین کی مدد کریں۔

اعلان کیا گیا کہ آئندہ امریکہ اور برطانیہ یا ان کے عوام کو کسی قسم کی خصوصی مراعات نہیں دی جائیں گی۔ لَجْنة العربيةِ العليا کا الهيئةُ العربيةُ العُليا کے نام سے احیا کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ مسلمانوں کے اس احتجاج و مطالبات کا امریکہ و برطانیہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جولائی میں امریکی و برطانوی اعلی عہدے داروں کی ایک کونسل کا اجلاس ہوا جس کی سربراہی برطانوی لیڈر ایوانِ زیریں (ہاؤس آف کامنز) ہربرٹ سٹینلے موریسن نے کی۔ اس نے فلسطین کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا۔ ایک حصہ یہودیوں کو اور ایک حصہ مسلمانوں کو دیا جائے گا۔ قدس کو ایک الگ حصہ بنایا جائے گا جہاں کے رہنے والے انتخابی عمل کے ذریعے اپنی انتظامیہ منتخب کریں گے البتہ کچھ نمائندے ہائی کمشنر خود نامزد کرے گا۔ نقب کے علاقے میں فلسطین کی مرکزی حکومت قائم ہوگی جو برطانوی ہائی کمشنر کے تحت ہوگی۔ تینوں حصے اپنے داخلی قوانین خود بنا سکیں گے جس کے لیے ہائی کمشنر کی منظوری ضروری ہوگی۔ البتہ دفاع وغیرہ مرکزی حکومت کے پاس ہوں گے۔ ہجرت کے بارے میں کہا گیا کہ ہر علاقائی حکومت اپنی حدود میں دوسروں کے داخلے کے متعلق قانون سازی کرنے میں خود مختار ہوگی۔

اس کے فوری بعد بعض یہودیوں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ یورپ کی طرف سے ایک لاکھ یہودیوں کو مجوزہ یہودی علاقے میں لا بسایا جائے۔ ان کی نقل و حرکت کے علاوہ دو مہینے کے اخراجات بھی امریکہ برداشت کرے۔ امریکہ میں اس تجویز کی پذیرائی موجود تھی۔ مسلمانوں نے تو اس کی مخالفت کرنی ہی تھی خود یہودی تحریک کی طرف سے اس تجویز کو ناقابلِ عمل قرار دے دیا گیا۔ ان کے خیال میں یہودیوں کے لیے تجویز کردہ علاقہ اتنی بڑی ہجرت کی وسعت ہی نہ رکھتا تھا اور مذکورہ ہجرت کے لیے انھیں مزید علاقہ درکار تھا۔ اس کے علاوہ برطانیہ نے بھی اس امر کی مخالفت کی۔ برطانیہ اگرچہ یہودیوں کا حامی تھا لیکن وہ تدریج و سلیقے سے کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی شدتِ جذبات میں کمی آجائے گی اور وہ یہودیوں اور مسلمانوں کو ایک صفحے پہ لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن سست روی کی یہ پالیسی صیہونی شدت پسندوں کو پسند نہ تھی۔ اسی لیے وہ برطانیہ کے مخالف ہو رہے تھے یہاں تک کہ برطانیہ کے خلاف دہشت گردی کے بھی مرتکب ہو رہے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد برطانیہ روبہ زوال تھا جب کہ امریکہ ایک طاقت ور اور بااثر ملک کے طور پر سامنے آیا تھا اور یہودیوں کو امریکہ کی بھرپور تائید حاصل ہوگئی تھی۔ چنانچہ وائزمین نے اسرائیل کے قیام کو اپنی خارجہ پالیسی کا حصہ قرار دیا تھا۔ نیز ۱۹۴۶ء کے امریکی الیکشن میں یہودیوں نے ہیری ٹرومین کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا جس کے جواب میں امریکی سرپرستی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

اگست ۱۹۴۶ء میں یہودیوں نے بحری جہازوں میں کئی ہزار یہودی مہاجرین غیر قانونی طور پر فلسطین کی طرف روانہ کیے۔ حکومتِ برطانیہ نے اعلان کیا کہ ہم ان جہازوں کو قبرص جزیرے کی طرف بھیج دیں گے اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں لندن میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جو اکتوبر تک جاری رہی جس میں عرب ملکوں کے علاوہ یہودی، امریکہ اور برطانیہ شامل تھے۔ وزیرِاعظم ایٹلی نے ابتدائی خطاب کیا۔ اس نے کہا کہ مورسین فارمولے پر جب تک تمام فریقین کی آرا سامنے نہ آئیں ہم کوئی فیصلہ نہ کریں گے۔ اس نے تمام لوگوں سے کہا کہ اس کانفرنس میں وہ پوری آزادی سے اپنا نقطۂ نظر بیان کریں۔

عرب وفد کا مطالبہ یہ تھا کہ فلسطین کی تقسیم کے بجائے یہاں ایک متحدہ مملکت اور منتخب دستوری حکومت قائم کی جائے۔ مئی ۱۹۳۶ء سے پہلے جن لوگوں کو فلسطین کی شہریت ملی ہوئی ہے صرف انھی کو فلسطین کا شہری تسلیم کیا جائے۔ فلسطین میں قیام کی مدت دس سال مقرر کی جائے۔ پارلیمنٹ میں یہودی اراکین کی تعداد دو تہائی سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ یہودیوں کی ہجرت پر فی الفور مکمل پابندی لگائی جائے۔ زمین کی خرید وفروخت اور انتقال پر بھی پابندی لگائی جائے۔ مستقبل کی فلسطینی حکومت کو برطانیہ کا حلیف تسلیم کیا جائے۔ نئی حکومت کے قیام کی آخری مدت ۳۱، دسمبر ۱۹۴۸ء تک مقرر کی جائے اور اس سے تاخیر نہ کی جائے۔ برطانیہ نے ان شرائط کے مطالعے اور غوروخوض کی غرض سے دوسرے اجلاس کو دسمبر ۱۹۴۶ء تک موخر کیا۔ لیکن درمیان میں اقوامِ متحدہ کا اجلاس آجانے کے سبب اگلا اجلاس جنوری ۱۹۴۷ء میں ہی منعقد ہوسکا۔

اس دوران، برطانوی اور امریکی اعلیٰ عہدے داروں سے یہودیوں کے مختلف وفود کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں برطانوی وزارتِ استعمار اور وزارتِ خارجہ کے ساتھ لندن میں یہودیوں کے

مذاکرات ہوئے، ایسی ہی ایک ملاقات کے بعد لندن میں برطانوی عہدے دار کی طرف سے بیان دیا گیا کہ جن کا موضوع فلسطین کے معاملے کو حل کرنے کے ابتدائی اقدامات تھا۔ ایک ہفتے کے ان مذاکرات کے بعد یہودی کونسل کے ایک رکن ناہوم گولڈ مین نے پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ ہمارے اور برطانیہ کے درمیان ۱۹۳۶ء میں اعلان کردہ حدود پر نقب کے علاقے کے اضافے کے ساتھ یہودی ریاست قائم کرنے پر اتفاق ہو چکا ہے۔ نیا وزیرِ استعمار جونز یہودیوں کا زبردست حامی تھا۔ اس نے یہودیوں کو خوش کرنے کے لیے فلسطین میں یہودیوں پر دہشت گردی کے نتیجے میں قائم مقدمے ختم کرا دیے بلکہ بہت سارے قید دہشت گرد راہنما اور کارندے آزاد کر دیے گئے۔ اس کے باوجود یہودیوں کی دہشت گردی میں کمی نہیں آئی بلکہ صرف پہلے مہینے ہی میں ۱۸، افراد قتل اور ۱۹ زخمی کیے گئے جو برطانوی فوج یا پولیس کے اہلکار تھے۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں لندن کانفرنس کے دوسرے دور کے لیے مسلمانوں اور یہودیوں کو بلایا گیا۔ برطانیہ کی طرف سے یہ سفارشات پیش کی گئیں کہ پانچ سال میں تدریجی طور پر ایک داخلی حکومت تشکیل دی جائے گی۔ اقلیتوں کے تحفظ کی ذمے داری ہائی کمشنر کی ہوگی جو ایک مجلسِ مشاورت تشکیل دے گا۔ چوتھے سال کے اختتام پر تاسیسی اسمبلی کا انتخاب کرایا جائے گا اور جب مسلم و یہود کے منتخب نمائندے باہم متفق ہو جائیں گے تو پھر حتی الامکان جلد از جلد مستقل ریاست قائم کر دی جائے گی۔ عدم اتفاق کی صورت میں معاملہ اقوامِ متحدہ کی ٹرسٹی شپ کونسل میں پیش کیا جائے گا۔

پہلے دو سالوں میں چھیانوے ہزار یہودی مہاجرین کی آباد کاری کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا البتہ اس میں ہائی کمشنر کو اختیار دیا گیا کہ وہ مختلف شہروں کے وسائل کے مطابق فیصلہ کرے کہ کس شہر میں کتنے مہاجرین کو آباد کرنا ہے۔ اس اعلامیے سے یہود و مسلم دونوں نے اپنی اپنی وجوہات کے سبب مخالفت کی جس کو بنیاد بنا کر ۱۴، فروری ۱۹۴۷ء کو برطانیہ نے اپنا مینڈیٹ (حقِ استبداد) اقوامِ متحدہ کو سونپتے ہوئے خود اس قضیے سے علاحدگی اختیار کر لی تاکہ عالمی ادارہ اس مسئلے کا کوئی حل نکال سکے۔

۲۵ فروری کو ارنسٹ بیون نے برطانوی پارلیمنٹ میں خطاب کیا جس میں اس نے یہودیوں کو مکار اور

دھوکے باز قرار دیا۔ اس نے معاملے کو اقوامِ متحدہ میں پیش کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اقوامِ متحدہ کو سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ کیا فلسطین کو یہودیوں کے دعووں کے مطابق یہودی ریاست بننا چاہیے یا دوسری قوموں کا بھی اس پر حق ہے۔ بیون نے کہا کہ معاملہ صرف ایک لاکھ یہودی مہاجرین کی آباد کاری کا نہیں بلکہ یہ محض ابتدا ہے اور یہود کے ارادے اس سے کہیں زیادہ کے ہیں۔ اس نے کہا کہ عربوں کا سوال یہ ہے کہ یہود فلسطین میں اقلیت ہو کر بھی مسلمانوں کے زیرِ حکومت نہیں رہنا چاہتے تو ہم مسلمان ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ میں اس معزز ایوان سے پوچھتا ہوں کہ اس فلسطینی سوال کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ میرے پاس تو اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

جاری ہے

*****

کتابیات:

القدس و المسجد الأقصى عبر التاريخ، دكتور محمد علي البار، دارالقلم، دمشق

و اقدساه، دكتور سيد حسين العفاني مكتبة دار البيان الحديثية، السعودية، الطائف

فلسطين في عهد الانتداب، دكتور أحمد طربين، shorturl.at/druNO

الثورة الكبرىٰ العربية في فلسطين، صبحي محمد ياسين، noor-book.com/wgper0

مذكرات عوني عبد الهادي، مركز دراسات الوحدةالعربية، بيروت لبنان، سبتمبر ۲۰۰۲ء

مولانا عبدالغفور صدیقی
استاذ فقہ اکیڈمی

حماس الفتح معاہدہ اور چین کا کردار

فلسطین کی دو سیاسی حریف تنظیمیں حماس اور الفتح نے چین میں سہ روزہ مذاکرات کے بعد قومی مفاہمت کے ایک معاہدے پر اتفاق کیا ہے۔ دارالحکومت بیجنگ میں قومی مصالحت کے ایجنڈے کے تحت منعقد ہونے والے ان مذاکرات میں الفتح اور حماس سمیت چودہ فلسطینی تنظیموں نے شرکت کی۔ چینی وزیرِ خارجہ وانگ یی کی ثالثی میں ہونے والے ان مذاکرات میں حماس کی نمائندگی بین الاقوامی امور کے سربراہ موسیٰ ابو مرزوق نے کی، جب کہ الفتح کی طرف سے مرکزی کمیٹی کے رکن محمود علول شریک ہوئے۔ اختتامی تقریب میں سعودی عرب، ترکیہ، روس، مصر، شام، قطر، اردن، الجزائر اور لبنان کے سفیر اور نمائندے بھی شریک ہوئے۔ مشترکہ اعلامیے میں تمام فلسطینی تنظیموں نے اختلافات ختم کرکے فلسطین کی بہبود کے لیے مل کر کام کرنے اعلان کیا۔

اس معاہدے کی سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ دونوں جماعتوں نے جنگ کے بعد غزہ پر حکمرانی کے لیے ایک عبوری قومی مصالحتی حکومت تشکیل دینے پر اتفاق کیا، جب کہ غزہ کی تعمیرِ نو، نئے انتخابات کا جلد انعقاد، اور غربِ اردن، مشرقی بیت المقدس اور غزہ پر مشتمل فلسطینی ریاست کی سالمیت کو برقرار رکھنا بھی اس معاہدے کے نکات میں شامل ہے۔ نیز قومی اتحاد و یک جہتی کے فروغ اور مذکورہ معاہدے کو پائیدار بنانے کے لیے تمام جماعتوں نے باہم مل کر ایک جامع لائحۂ عمل مرتب کرنے پر بھی اتفاق کیا۔ چینی وزیرِ خارجہ نے بھی اپنے خطاب میں فلسطینی ریاست کی سالمیت، جنگ کے بعد غزہ کی تعمیرِ نو اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعے سلامتی کونسل میں فلسطین کی مستقل رکنیت کے حصول کو مذکورہ معاہدے کا اہم ہدف قرار دیا۔

حماس اور الفتح کے درمیان تعلقات ۲۰۰۶ء سے انتہائی کشیدہ ہیں۔ جب فلسطین کے پارلیمانی انتخابات میں

الفتح کی قیادت حماس کے واضح مینڈیٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے معاندانہ اقدامات پر اتر آئی تھی۔ اس وقت بھی تحریکِ حماس نے اپنے واضح مینڈیٹ کے باوجود فلسطین کے وسیع تر قومی مفاد کے پیشِ نظر لچک دکھاتے ہوئے ایک قومی حکومت کے قیام پر اتفاق کیا تھا، لیکن الفتح حماس کا وجود ہی مٹانے کے درپے تھی جس کی وجہ سے مصالحت کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہ ہوسکی، بالآخر اہلِ غزہ کی شدید مزاحمت کی تاب نہ لاتے ہوئے الفتح کو غزہ سے پسپا ہونا پڑا۔ تب سے غزہ حماس کی عمل داری میں ہے، جب کہ الفتح مغربی کنارے تک محدود ہوگئی۔

دونوں تنظیموں کے درمیان ایک بنیادی نظریاتی خلیج بھی حائل ہے، کیونکہ حماس فلسطین کے کسی بھی حصے پر اسرائیلی وجود کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتی، اور اس ناجائز ریاست کے خاتمے کو اپنی منزل قرار دیتی ہے جس کے حصول کے لیے عسکری جدوجہد اس کے نزدیک سب سے اہم ذریعہ ہے۔ دوسری طرف الفتح مغربی کنارا، مشرقی بیت المقدس اور غزہ کے علاوہ باقی ارضِ فلسطین پر اسرائیلی وجود کو اوسلو معاہدے میں تسلیم کرچکی ہے۔ اس نے اپنے منشور سے عسکری جدوجہد کی شقوں کو حذف کرکے مفاہمت و مذاکرات کے ذریعے پُرامن تصفیے کو چارٹر کا حصہ بنایا ہے۔ فلسطین نیشنل اتھارٹی کے قیام کے بعد حماس کے خاتمے کے لیے اس کے خلاف الفتح کے پندرہ سال تک روا رکھے گئے مظالم بھی ابھی تک تاریخ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئے ہوں گے۔

بایں ہمہ موجودہ حالات میں دونوں تنظیموں کا متحد ہونا فلسطینی ریاست کی سلامتی و استحکام کے لیے انتہائی ناگزیر تھا جس کے بغیر مابعد جنگ کے، غزہ کی صورتِ حال ہزار ہا خدشوں سے بھرپور تھی، اسرائیل گذشتہ نو ماہ کے دوران اپنی تمام تر توانائی صرف کرکے غزہ کو کھنڈرات میں تبدیل کرنے اور چالیس ہزار سے زیادہ معصوموں کو شہید اور لاکھوں کو معذور و اپاہج بنانے کے باوجود بھی اپنے متعیّن کردہ اہداف کا سراغ بھی نہیں پاسکا۔ حماس کا خاتمہ تو دور کی بات، ابھی تک اس کی قید سے اپنے لوگ تک نہیں چھڑا سکا، نہ سرنگوں کا نیٹ ورک دریافت کرکے تباہ کرسکا اور نہ ہی حماس کی چوٹی کی لیڈر شپ کا کُچھ بگاڑ سکا، یہ واضح ہے کہ اسرائیل کو ابھی تک غزہ میں کوئی علامتی کامیابی بھی نہیں ملی۔

جب کہ اس کے برعکس خود اس کی اپنی سلامتی داؤ پر لگ چکی ہے، غزہ کی سرزمین اسرائیل کے قیمتی

ٹینکوں کا قبرستان بن چکی ہے اور اس کی ڈیفنس فورسز کی بڑی تعداد بھی اس جنگ میں کھپ چکی ہے۔ فوج میں عجیب و غریب بیماریوں اور نفسیاتی مسائل نے صورتِ حال کو مزید گھمبیر بنا دیا ہے۔ بحیرۂ احمر میں حوثی حملوں سے تجارت متاثر ہونے کے بعد اب حوثی میزائل تل ابیب پر دستک دینے لگے ہیں۔ ایلات کی بندرگاہ پر تقریباً تمام سرگرمیاں ٹھپ ہو رہی ہیں۔ دوسری جانب شمالی اسرائیل میں حزب اللہ کے خوف سے شہریوں کی بڑی تعداد علاقے سے انخلا کر چکی ہے، حالات اس نہج پر ہیں کہ اسرائیلی شہری عدمِ تحفظ کے شدید احساس سے چور ہو کر ملک سے کوچ کر رہے ہیں۔ اسرائیلی آقاؤں کے دیس سمیت پوری دنیا میں اسرائیلی ہزیمت و خجالت کے رسواکن چرچے اپنے عروج پر ہیں۔ فلسطین کے حق میں پوری دنیا کی رائے عامہ جس طرح اب ہموار ہوئی ہے اس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔

امریکہ بہادر بھی اسرائیلی بربریت کے مزید جواز پیش کرنے اور اپنے عوام کو مطمئن کرنے سے عاجز آچکا ہے۔ صدارتی امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ اور کملا ہیرس ہر دو غزہ جنگ کے خاتمے کا کریڈٹ لے کر ووٹ حاصل کرنے کے متمنّی ہیں۔ نیتن یاہو کے حالیہ دورۂ امریکہ کے دوران مذکورہ امیدواران جنگ بندی کے علاوہ کسی بھی بات پر آمادہ دکھائی نہیں دیے۔ ان تمام تر حالات کے تناظر میں جلد یا بدیر غزہ جنگ بندی بدیہی امر ہے۔ نیتن یاہو کی طرف سے یقین دہانیاں اور امریکی ایوانِ نمائندگان میں اس کی طرف سے حماس کی شکست کے کھوکھلے اعلان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔

حماس کے خاتمے کے بغیر جنگ بندی کے کسی بھی امکان کو مسترد کرنے والا اسرائیل اب مصر میں جنگ بندی کے مذاکرات کے دوران غزہ پر اپنا سیکیورٹی کنٹرول برقرار رکھنے کی شرط لگا کر جنگ بندی کی پیشکش کر رہا ہے۔ لیکن فلسطینی تنظیموں کے درمیان مصالحت اور پی۔ ایل۔ او کے تحت عبوری قومی حکومت کے قیام سے مذکورہ اسرائیلی منصوبے کے عملی نفاذ کا جواز باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے کہ پی۔ ایل۔ او اقوامِ عالم کے نزدیک فلسطین کی تسلیم شدہ اور حقیقی اتھارٹی ہے۔

جنگ کے بعد سب سے بڑا چیلنج غزہ کی تعمیرِ نو اور لٹے پٹے فلسطینیوں کی واپسی اور دوبارہ آبادکاری ہے اور

یہ عمل حماس کے لیے اس مصالحت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ مصالحتی عمل الفتح کے لیے بھی انتہائی اہم ہے۔ کیوں کہ وہ تمام تر مفاہمت اور امن مذاکرات کے باوجود مغربی کنارے میں اسرائیلی مظالم کا سدِباب نہیں کرسکی۔ پہلے سے موجود یہودی بستیوں میں کمی تو دور کی بات وہ مزید بڑھتی ہوئی یہودی آباد کاری کو بھی روکنے سے عاجز ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشرقی بیت المقدس کے حصول کے عزم پر بھی اب اوس پڑ چکی ہے۔ نتیجتاً مغربی کنارے کے عوام اس سے شدید مایوس تھے، یہ معاہدہ اس کے لیے بھی نئی توانائی اور مقبولیت کا سبب بنے گا۔

چین فلسطین تعلقات کا تاریخی تناظر

چین میں کمیونسٹ انقلاب کی کامیابی اور ۱۹۴۹ء میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے بعد مسئلۂ تائیوان چین کی خارجہ پالیسی کا محور و مرکز رہا ہے۔ کیونکہ کیمونسٹ پارٹی کی حریف چینی نیشنلسٹ پارٹی نے جنرل جیانگ کائی شیک کی قیادت میں تائیوان پر قبضہ کرکے جمہوریہ چین کے نام سے حکومت قائم کرلی۔ چنانچہ مغرب اور اس کے اتحادیوں نے کمیونزم کے عروج سے خوف زدہ ہوکر اس چھوٹے سے جزیرے پر قائم حکومت کو پورے چین کی نمائندہ خود مختار ریاست کے طور پر قبول کرکے اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں مستقل رکنیّت بھی دلا دی، ۱۹۵۰ء میں جب سوشلسٹ شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر حملہ کیا تو اقوامِ متحدہ کی کمان میں امریکی فوجی مداخلت اور ۱۹۵۵ء میں ویتنام تنازعے بالخصوص ۱۹۶۵ء میں ویتنام میں امریکی فوجی دستوں کی تعیناتی کے بعد چین کے امریکہ و یورپ کے ساتھ تعلقات انتہائی کشیدہ ہوگئے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی مدد سے چین امریکہ تعلقات قائم ہوئے۔ یہی تعلقات سلامتی کونسل میں چین کی مستقل رکنیت کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

اسرائیل چونکہ امریکہ و یورپ کی طفیلی ریاست تھی اس لیے چین نے ہمیشہ اسرائیل کو سامراج کے ایک حصّے کے طور پر بیان کیا، اور اس کو تائیوان سے تشبیہ دیتے ہوئے ایک ناجائز ریاست سے تعبیر کیا۔

انقلابِ چین کے رہنما اور عوامی جمہوریہ چین کے بانی ماؤزے تنگ نے تیسری دنیا میں آزادی کی تحریکوں کی حمایت اور سامراج دشمن تنظیموں کی مدد کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہوئے فلسطین کی جدوجہدِ آزادی کی بھر پور حمایت کی، چین نے ۱۹۵۶ء کی جنگ میں مصر کی حمایت کرتے ہوئے اسرائیل، فرانس اور برطانوی حملوں کو

کھلی جارحیت قرار دیا۔

۱۹۶۴ء میں جب فلسطین لبریشن آرگنائزیشن قائم ہوئی تو چین نے اس کو فلسطین کی نمائندہ تنظیم کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے بیجنگ میں اپنا دفتر کھولنے کی بھی اجازت دی، پہلے پی۔ایل۔او کے رہنما احمد شقیری اور پھر ۱۹۶۵ء میں یاسر عرفات اور ابو جہاد خلیل وزیر نے چین کا دورہ کیا۔اس دوران چینی رہنما کی طرف سے ان کو ہر قسم کی ممکنہ امداد کی یقین دہانی کروائی گئی۔

پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین کے کمیونسٹ رہنما جارج حبش کے بھی چین کے ساتھ قریبی تعلقات رہے۔۱۹۶۷ء کی جنگ میں چین نے مصر کی حمایت کی، اس جنگ کے بعد چین نے شام، لبنان اور مصر میں موجود فلسطینی تنظیموں کی بھرپور مالی امداد کے ساتھ ساتھ ان کو اسلحہ بھی فراہم کیا، جو رائفلز، ہینڈ گرنیڈ اور بارودی سرنگوں پر مشتمل تھا۔

۱۹۷۶ء میں ماؤزے تنگ کی وفات کے بعد بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں چینی پالیسی میں قدرے تبدیلی رونما ہوئی، ۱۹۷۹ء میں چین کے اسرائیل کے ساتھ بھی روابط قائم ہوئے۔اب فلسطینیوں کے لیے چین کی عسکری مدد بند ہوگئی اور مالی مدد میں بھی کمی واقع ہوئی، لیکن چین فلسطینیوں کی اخلاقی حمایت سے دست بردار نہیں ہوا۔چنانچہ جب ۱۹۸۸ء میں الجزائر میں آزاد فلسطینی ریاست کا اعلان ہوا تو اس کے ایک ہفتے بعد چین نے بھی باقاعدہ طور پر فلسطینی ریاست کو تسلیم کر لیا۔اسی سال بیجنگ میں موجود پی۔ایل۔او کے دفتر کو ریاستِ فلسطین کے سفارت خانے میں تبدیل کر دیا گیا۔

میڈرڈ امن کانفرنس کے بعد ۱۹۹۲ء میں چین کے اسرائیل کے ساتھ باقاعدہ سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ ۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدے کے بعد چین نے فلسطین میں بھی سفارتی مشن مقرر کیا جو آج بھی رام اللہ میں فعال ہے۔چین کے حماس کے ساتھ بھی روابط ہیں، اس نے امریکہ و مغرب کی طرح حماس کو دہشت گرد تنظیم قرار نہیں دیا، ۷، اکتوبر ۲۰۲۳ء کو حماس کی جانب سے طوفان الاقصیٰ حملے کی چین نے کبھی مذمت نہیں کی، بلکہ وہ غیر جانبدار پالیسی کے تحت فریقین سے تحمل اور جنگ بندی کا مطالبہ کرتا ہے۔فلسطین کے ساتھ چین

کے تجارتی تعلقات بھی ہیں۔ ۲۰۱۷ء میں چین میں فلسطین کے سفیر فریز مہداوی کے مطابق چین سے فلسطینی درآمدات کا حجم سالانہ تین ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ ۱۹۹۳ء سے اب تک چین، مسئلہ فلسطین کے دو ریاستی حل کے لیے تین امن منصوبے بھی پیش کر چکا ہے اور کئی بار امن مذاکرات کی میزبانی کی بھی پیشکش کی ہے۔

دوسری جانب چین کے اسرائیل کے ساتھ بھی انتہائی قریبی تعلقات ہیں۔ بلکہ چین ایشیا میں اسرائیل کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار ہے۔ ۲۰۲۰ء سے ۲۰۲۲ء تک چین دنیا میں اسرائیلی برآمدات کا سب سے بڑا درآمد کنندہ تھا، چین نے ٹیکنالوجی کے شعبے میں اسرائیل کی تخلیقی صلاحیتوں سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ ہر سال ایک لاکھ سے زیادہ اسرائیلی سیاحت کی غرض سے چین آتے ہیں، اسرائیلی یونی ورسٹیوں میں چینی طلبہ کے لیے الگ سے کوٹہ مختص کیا گیا ہے۔ چین میں یہودیوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہیں، لیکن انتہائی بااثر ہونے کی وجہ سے انھوں نے چین اور اسرائیل کے درمیان تعلق کو فروغ دینے میں متحرک کردار ادا کیا ہے۔

چین نے غیر جانب داری، عدمِ مداخلت اور تنازعات میں ثالثی کی پالیسی اپنا کر مغربی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں انتہائی رسوخ حاصل کر لیا ہے، اس سے قبل چین نے سعودیہ اور ایران جیسے روایتی حریفوں کو بھی قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ خطہ چین کی بہت بڑی تجارتی منڈی ہے۔ یہاں کا امن چین کے معاشی و سیاسی مفادات کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ خطہ چین کے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے طور پر بھی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس منصوبے کا ایک حصہ بحرِ ہند سے عمان، یمن اور وہاں سے مشرقِ وسطیٰ کی طرف گھوم کر ایک دوسرے روٹ سے مل جاتا ہے۔

* * * * *

مولانا عبدالمتین

امتِ مسلمہ کی خصوصیت: اعتدال اور میانہ روی

اللہ ربّ العزت فرماتے ہیں: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا﴾ ’’اور (مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امّت بنایا ہے‘‘۔ اللہ ربّ العزت اس آیتِ کریمہ میں امتِ محمدیہ کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے ایک خاص اصطلاح ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے تمھیں ’’امتِ وسط‘‘ بنایا ہے۔ عربی میں ’’وسط‘‘ درمیانہ پن، اعتدال، میانہ روی اور بیچ کے راستے کو کہتے ہیں۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ جو چیز درمیان میں ہوتی ہے وہ زیادہ اچھی لگتی ہے اور زیادہ آویزاں ہوتی ہے، اور اسی طرح کسی مجلس میں اسٹیج جب بنتا ہے تو بالکل بیچ میں بنتا ہے اور صدرِ مجلس کی کرسی بالکل اسٹیج کے بیچ میں لگائی جاتی ہے، تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ یہ اس مجلس میں سب سے معزز ہیں۔ تو اللہ ربّ العزت فرماتے ہیں کہ تمھاری بھی خصوصیت ایسی ہی ہے کہ تم اِفراط و تفریط کا شکار نہیں ہو، نہ تم حد سے آگے بڑھنے والے ہو اور نہ حد سے گرنے والے ہو، اس لیے کہ ہم نے تمھیں ایک معتدل اور درمیانی امت بنایا جو اعتدال پر اور انصاف پر قائم رہنے والی ہے۔ تاکہ تم روزِ محشر لوگوں پر گواہ بن سکو اور حضور ﷺ تم پر گواہ بن سکیں۔ لہٰذا تمھاری سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تم امتِ معتدل اور امتِ وسط ہو۔

آپ ﷺ کا صحابہؓ کرام کو اعتدال کی تربیت دینا

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ تین اشخاص نبی ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھنے کے لیے نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے پاس آئے، جب انھیں اس کے متعلق بتایا گیا، تو گویا انھوں نے اسے کم محسوس کیا، چنانچہ انھوں نے کہا: ہماری نبی ﷺ سے کیا نسبت؟ اللہ نے تو ان کی اگلی پچھلی تمام خطائیں معاف فرمادی ہیں، ان میں سے ایک نے کہا: میں تو ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں دن کے وقت ہمیشہ

روزہ رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا اور تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے اجتناب کروں گا اور میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے اور پوچھا: ”تم وہ لوگ ہو جنھوں نے اس طرح کہا ہے؟ اللہ کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، رات کو نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں“۔ (بخاری) بہت ہی خوب صورت اور تسلی بخش انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے توسط سے امت کو اعتدال کا پیغام دیا اور اپنی مثال دے کر بیان فرمایا تاکہ اس پر عمل کرنا، مشاہدہ کرنا، سیکھنا آسان ہو جائے اور ایک حتمی نکتہ یوں بیان فرمایا کہ یہی میرا طریقہ ہے یہی شریعت ہے اور اسی معتدل انداز میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔

شریعت کا منہج و مزاج

شریعت یہ نہیں بتاتی کہ زندگی میں بیک وقت دین رہے گا یا دنیا رہے گی، یہ نہیں کہ اگر میں عبادت میں مگن رہا تو کسی سے تعلق نہیں رکھوں گا، نہ یہ کہ میں مکمل بازار سے چمٹ جاؤں یا پھر مسجد سے۔ بلکہ شریعت بتاتی ہے کہ تم نے دین دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا ہے۔ تم نے تجارت بھی کرنی ہے اور عبادت کے فرائض بھی انجام دینے ہیں، تم نے اللہ کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں اور اللہ کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تم اللہ کے حقوق ادا کرنے میں بندوں کے حقوق سے غافل ہو جاؤ اور نہ ایسا کہ بندوں کی خدمت میں ایسے لگے رہو کہ خدا کی بندگی ہی بھول جاؤ۔ البتہ شریعت فرق سمجھا دیتی ہے کہ تم مال کے لیے محنت ضرور کرو لیکن اسے اپنی ضرورت سمجھو اپنا مقصد مت سمجھو ورنہ تم ”حبِ مال“ کی بیماری کا شکار ہو جاؤ گے۔ اسی طرح دنیاداری کرو لیکن دنیا کے لیے اتنی ہی کوشش کرو جتنا تمھیں یہاں رہنا ہے اور آخرت کے لیے اتنی کوشش کرو جتنا تمھیں وہاں رہنا ہے اگر تم دنیا کی مختصر سی زندگی کے لیے آخرت والی محنت کرنا شروع کرو گے تو تم ”حبِ دنیا“ کی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام خرابیوں کی جڑ والی بیماری قرار دیتے ہیں۔

عقائد میں اعتدال کی تعلیم

ایک مسلمان کے لیے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ تمام عقائد ایک برابر نہیں بلکہ ان میں ایک ترتیب قائم ہے، مثلاً توحید کو عقائد میں سب سے پہلا درجہ حاصل ہے اور رسالت کو دوسرا۔ اب اگر کوئی عقیدۂ رسالت پر اتنا زور دینے لگ جائے کہ اسے توحید سے بھی زیادہ اہم ثابت کرے تو یہ اعتدال کی پٹڑی سے ہٹ جانے والی بات ہے۔ اسی طرح عقائد میں اعتدال نہ ہونے کی ایک بڑی شکل یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کو اس درجہ شدت سے بیان کیا جائے کہ امت کے ہر دوسرے فرد کو مشرک سمجھنے لگے۔ توحید پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہرگز درست نہیں کہ اولیاء اللہ کی گستاخی کی جائے، ان کی کرامات کا انکار کیا جائے اور توحید کو سمجھانے کے بہانے اہل اللہ پر مزاحیہ جملے کسے جائیں معاذ اللہ! یہ توحید کے بیان کرنے کا طریقہ ہے نہ ہی دعوتی حکمت عملی کے موافق ہے۔ بے شک توحید دین کا مرکزی ستون ہے اور شرک گناہ عظیم بلکہ ظلم عظیم ہے، لیکن اس کی آڑ میں اسی توحید کے داعی صوفیا اور اولیا کی کردار کشی کرتے ہوئے سستے بازاری جملوں کا استعمال بالکل مناسب نہیں۔ اسی طرح انبیا علیہم السلام اور بزرگانِ دین کے ساتھ عقیدت و محبت کا تعلق پیدا ہو جانا ایک بہت لازمی امر ہے اور اس کے بغیر دین کے بہت سے پہلو ادھورے رہ جاتے ہیں، لیکن اپنے سوا ہر ایک کو گستاخ قرار دینا اور محبت و عقیدت کو اپنا ٹھیکہ سمجھ لینا غلط بات ہے۔ اسی طرح عقیدت کی آڑ میں اولیا کو صحابہ سے بلند مرتبہ دینا یا انبیا کو خدا کا مرتبہ دینا اور پھر عقیدت کی اوڑھنی اوڑھ کر شرک، بدعت کے دھندوں میں لگ جانا، اسلاف کے مدفن بیچ کھانا اور یہ سب عاشقِ رسول کا لیبل لگا کر کرنا، جس پر اضافہ یہ کہ اس عقیدت کے سہارے خود کو توحید نماز روزہ حج جیسی بنیادی عبادات سے بری سمجھنا یہ سوچ کر کہ یہی عقیدت میری نجات کے لیے کافی ہے یہ جہالت کی انتہا ہے، جو کہ امت مسلمہ کی اعتدال والی خصوصیت کے یکسر خلاف ہے۔

تحریکات میں اعتدال کی ضرورت

اعتدال کا جنازہ نکالنے میں مختلف دینی تحریکات کے ناسمجھ کارکن بھی پیش پیش رہتے ہیں اور ہر ایک کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ دین کا کام اسی طرز پر کرنے کی ضرورت ہے جس طرز پر ہماری تحریک کارفرما ہے۔ حالانکہ یہ

بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ دین کے مختلف شعبہ جات ہیں اور تمام شعبہ جات کو ایک ساتھ کرنے کی خصوصیت صرف رسول اللہ ﷺ کو حاصل تھی جو تلاوتِ کتاب، تعلیمِ کتاب، تعلیمِ حکمت اور تزکیہ نفس کی صورت میں قرآن آپ کے اوصاف و منصب کے ضمن میں بیان کرتا ہے۔ باقی آپ کے دنیا سے جاتے ہی امت کے پہلے طبقے یعنی صحابہ کی جماعت میں ہی یہ سارے کام خوب صورت انداز میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ٹھیک یہی ترتیب امت کے موجودہ طبقے میں پائی جاتی ہے جو کہ سیاست، تعلیم و تعلم، سلوک و تصوف، دعوت و تبلیغ، تحقیق و تصنیف، جہاد و اعلاے کلمۃ اللہ وغیرہ کی صورت میں امت کر رہی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کام کو ناگزیر سمجھنا اور باقی سب کو بے کار یا کم اہمیت کا حامل سمجھنا یا پھر ہر ایک سے اپنی تحریک کے نظم کا تقاضہ کرنا یہ سب کے سب بے اعتدالی کے رویے ہیں۔ ان سب کو اعتدال پر لانے کی یہی ایک صورت ہے کہ امت کے کسی ایک شعبے پر لگ کر محنت کی جائے اور بقیہ شعبوں کو اپنا حریف اور مخالف سمجھنے کی بجائے ان کا رفیق بنا جائے۔ اور اس ایک درجہ یہ بھی ہے کہ بقیہ شعبہ جات کی مخالفت نہ کرے۔

دین و دنیا میں اعتدال کی تعلیم

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تیرے والدین زندہ ہیں ؟“ اس نے عرض کیا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: ”ان دونوں (کی خدمت) میں مجاہدہ (انتہائی کوشش) کر“۔ (بخاری) معلوم ہوا کہ جہاد تو بہت ہی عظیم عمل ہے لیکن ان صحابی کے لیے اس وقت ان کے والدین کی خدمت کرنا زیادہ عظیم عمل تھا تو آپ نے ان کو والدین کے ہاں جا کر ان کی خدمت میں لگے رہنے کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے اپنے اس فیصلے سے گویا شریعت کا یہ مزاج سمجھایا کہ تمھارے لیے اس موقعے پر دین پر عمل کرنے کی بہتر صورت کون سی ہے۔

خالق اور مخلوق کے حقوق کی ادائی میں اعتدال

علما بیان کرتے ہیں کہ اگر ایک ایسا شخص ہے کہ جس کا گھر مسجد حرام کے بالکل قریب ہے اتنا کہ وہ گھر سے نکلے اور مسجدِ حرام میں پہنچ جائے، لیکن اس کے گھر میں اس کی والدہ بیمار ہیں اور انھیں تیمارداری کی ضرورت ہے۔ اور وہ مریضہ ایسی صورتِ حال کا شکار ہے کہ اگر کوئی اسے چھوڑ کر چلا جائے تو اس کی حالت مزید بگڑ سکتی ہے، ضرورت ہے کہ اس کے پاس کوئی نہ کوئی رہے۔ جب اسی دوران عشا کی نماز کا وقت ہوتا ہے تو اس کا اکلوتا بیٹا یہ کہے کہ میں جاؤں اور مسجدِ حرام میں نماز پڑھوں تاکہ مجھے ایک لاکھ نمازیں پڑھنے کا ثواب ملے۔ تو شریعت یہ رہنمائی کرتی ہے کہ تم ایک لاکھ نمازیں پڑھنے کا ثواب حاصل مت کرو، بلکہ فی الحال تم گھر میں ہی نماز پڑھو اور اپنی ماں کا خیال رکھو، اس موقعے پر تمھارے لیے یہ زیادہ بہتر ہے۔ شریعت کی تعلیمات ایسی ہیں جو اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کے درمیان درمیانی راہ دکھلاتی ہیں کہ دنیا کے ایسے بھی نہ بنو کہ دین کو بالکل اپنی زندگی سے ہی نکال دو اور ایسے بھی نہ بنو کہ دنیا ہی کو اپنے دل میں بسا بیٹھو۔

انصاف اور اعتدال

ایک موقعے پر کسی قبیلے میں جنگ و جدل کا معاملہ پیش آیا تو آپ ﷺ نے صحابہ کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا: ”اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم“۔ صحابہ میں سے کسی نے کہا: اللہ کے رسول! میں نے مظلوم ہونے کی صورت میں تو اس کی مدد کی لیکن ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد کیسے کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اسے ظلم سے باز رکھو، اس کے لیے یہی تمھاری مدد ہے“۔ (ترمذی) شریعت نے دونوں کے متعلق احکام سمجھا دیے کہ تم نے یہاں کون سا رویہ اپنانا ہے اور وہاں کیا رویہ اپنانا ہے۔

مال کمانے کے متعلق اعتدال

اگر کوئی کہے کہ میں کماتا ہی نہیں کیونکہ کمانا دنیاداری ہے اور میں دین دار بننا چاہتا ہوں، تو یہ غلط رویہ ہے۔ کیونکہ حلال کمائی بھی دینی فرائض میں شامل ہے کتنی ہی ایسی عبادات ہیں جو مال خرچ کرکے ادا کی جاتی ہیں جیسے

زکوۃ، صدقہ، فطرہ، قربانی، حج، صلہ رحمی وغیرہ۔ اسی طرح اگر کوئی مال کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنالے اور اس پر کمانے جمع کرنے کی دھن سوار ہوجائے تو شریعت رہنمائی کرتی ہے کہ یہ بھی غلط طریقہ ہے کیونکہ مال کو اللہ نے انسان کی خدمت وضرورت کے لیے پیدا کیا ہے اپنے آپ کو اس پر کھپانے کے لیے پیدا نہیں کیا، لہذا تم مال کماؤ مگر اپنے مقصد کے لیے نہیں بلکہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے جب تمھاری ضرورت پوری ہوجائے تو تم مزید مال کو اپنا مقصد مت بناؤ۔

مال خرچ کرنے کے متعلق اعتدال

اسی طرح جب مال خرچ کرنے کی باری آتی ہے تو کوئی اپنے مال کو بے تحاشا خرچ کرتا ہے تو شریعت منع کرتی ہے کہ تم فضول خرچی اور اسراف سے بچو۔ اور اگر کوئی اپنے مال کو خرچ ہی نہیں کرتا تو شریعت یہ کہتی ہے کہ تم کنجوسی سے بھی بچو، جیسے اللہ ربّ العزت قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَم يُسرِفُوا وَلَم يَقتُرُوا وَكَانَ بَينَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ (الفرقان:٦٧) "اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان کا طریقہ اس (افراط وتفریط) کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے"۔ یعنی اللہ کریم ہمیں یہ بتلا رہے ہیں کہ رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو اعتدال اور میانہ روی پر قائم ہیں اور خرچ کرنے میں اعتدال پر قائم ودائم ہیں، افراط اور تفریط سے بچے ہوئے ہیں۔ کیونکہ جب ایک شخص فضول خرچی کرے گا تو پھر گناہ اور عیاشی میں مبتلا ہوجائے گا اور بہت سی غیر ضروری چیزوں کو ضروری سمجھ کر خریدنے کا بوجھ اٹھائے گا اور اگر کنجوسی کرے گا تو زکوۃ، قربانی، حج، صدقہ، خیرات، صلہ رحمی، اہل وعیال کے حقوق وغیرہ کیسے ادا کرے گا؟ اسی لیے شریعت نے اعتدال کی راہ دکھلائی کہ تمھیں انفاق بھی کرنا ہے اور اسراف سے بھی بچنا ہے۔

نوافل اور فرائض کے درمیان اعتدال

فرائض وہ ہیں جو کسی حال میں معاف نہیں جب کہ نوافل کہتے ہی ہیں اس عبادت کو جو لازم نہیں بلکہ اضافی اجر وثواب کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس حوالے سے بھی بہت افراط وتفریط ہے کہ ہم نوافل کو تو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ

جتنا فرائض کو نہیں دیتے، جیسے فضیلت والی راتیں آجاتی ہیں تو ان میں ساری رات عبادت کی جاتی ہے، لیکن جب فجر کی فرض نماز ادا کرنے کا وقت آجاتا ہے تو یہی نفلی عبادت کرنے والے سب سوجاتے ہیں۔ اس صورت میں نفلی عبادت کو زیادہ اہمیت دی جارہی ہے جس سے متعلق کوئی باز پرس نہیں ہوگی، لیکن فرض کو چھوڑا جارہا ہے، حالانکہ پہلا سوال ہی قیامت کے دن فرض نماز سے متعلق ہوگا۔ اسی طرح قربانی کے موقعے پر ہم میں سے جو قربانی کرنے کا اردہ کرتے ہیں وہ یکم ذی الحجہ سے قربانی تک اپنے ناخن اور جسم کے اضافی بالوں کو صاف نہیں کرتے، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک مستحب عمل ہے جس کا مطلب جو یہ عمل کرے گا اسے ثواب ملے گا اور جو نہیں کرے گا اسے کوئی گناہ نہیں ملے گا۔ لیکن حیرت ہے کہ ایک شخص دس دن تک یہ نفلی کام کرتا رہتا ہے ایک ایسا کام جو ثواب کا کام ہے اگر نہیں کرے گا تو اسے گناہ بھی نہیں ملے گا، لیکن جیسے ہی وہ قربانی کرتا ہے تو اپنی داڑھی کے بال بھی صاف کر دیتا ہے۔ حالانکہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ اگر میں ان دس دنوں وہ بال کاٹ لیتا تو مجھے کوئی گناہ نہ ملتا، لیکن داڑھی کاٹنا گناہِ کبیرہ ہے۔ ایک طرف نفلی عبادت کی فکر ہے اور دوسری طرف حرام کی بھی فکر نہیں تو یہ افراط و تفریط ہے۔

شادی بیاہ کے موقعے پر اعتدال

ہماری شادی بیاہ کی جو رسومات ہیں عام طور پر ان کے متعلق علما یہ فرماتے ہیں کے شادی شریعت کے مطابق کرو تو ہمارے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شریعت کے مطابق شادی شاید سوگ منانے جیسا عمل ہے۔ اگر شادی شریعت کے مطابق ہوگی تو سوگ والا ماحول ہوگا، تسبیح پڑھنی ہوگی، قرآن خوانی یا آیتِ کریمہ کا ختم کرنا ہوگا اور پھر ایسا لگے گا کہ خوشی کا ماحول ہی نہیں ہے۔ جب کہ ایسا بالکل نہیں ہے، شادی ایک خوشی کا موقع ہے اور اسے خوشی خوشی ہی منانا چاہیے اور خوشی منانے کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس سے منع نہیں کیا جارہا، لیکن چند شرائط بتائی جارہی ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے، مثلاً، بے پردگی نہ ہو، ڈھول باجا نہ ہو، ہندوانہ رسم و رواج نہ ہوں، ان شرائط کے ساتھ جیسے چاہو اپنی خوشی منالو۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ خود اس کی ترغیب دے رہے ہیں کہ نکاح کی تقریب کا بھرے مجمع میں اہتمام کرو، ولیمہ کرکے سب کو اپنی خوشی میں شریک کرو۔

آپس کے تعلقات میں اعتدال

اکثر ہمارے آپس کے تعلقات میں بھی افراط وتفریط پائی جاتی ہے، کسی سے اگر تعلق بنانا ہے تو ایسا تعلق قائم کریں گے کہ اس پر جان بھی نثار کریں گے، ہر وقت اسی کے ساتھ بیٹھک لگائیں گے، گپ شپ لگی رہے گی، وقت بے وقت یار کو ڈھونڈتے رہیں گے، کہیں آنا جانا، تقریبات میں شرکت کرنا، یہاں تک کہ لین دین بھی اسی کے ساتھ کرنے کا سوچیں گے۔ لیکن ایک اختلاف سے یہ گہری دوستی دشمنی میں بدل جاتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے تعلقات میں پائی جانے والی بڑی عام بے اعتدالی ہے جو ہم کرتے رہتے ہیں۔ اب شریعت یہ نہیں کہتی کہ ہم ہر ایک سے دوستیاں کرتے پھریں اور ہر ایک کو اپنے سر کا تاج بنالیں اور ہر ایک سے لین دین شروع کر دیں۔ بلکہ عام مسلمانوں کے حوالے سے جو روش اپنانی چاہیے اس کے متعلق فرمایا کہ ایک مسلمان کے مال، جان، عزت و آبرو کی تم حفاظت کرو، اس کے ساتھ علیک سلیک رکھو، ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کرو بس اتنا ہی کافی ہے۔ باقی کسی سے ایسی دوستی کرنا کہ اس کے غلط کو بھی صحیح قرار دینا اور کسی سے ایسی نفرت کرنا کہ اس کی ساری اچھائیاں نظر انداز کرنا دونوں رویے غلط ہیں۔ گر ہم کسی سے تعلق رکھتے ہیں تو اس میں خوبی بھی ہو سکتی ہے اور خامی بھی تو ہم اس کی خوبی پر نظر رکھیں اور اس کی خامی کو نظر انداز کریں۔

مزاج کا اعتدال

کوئی اپنے مزاج میں اتنی زیادہ بہادری رکھتا ہے کہ وہ ظالم بن جاتا ہے تو شریعت اس رویے کی مذمت کرتی ہے اور اگر کوئی اپنے مزاج میں اتنا ڈھیلا پن لاتا ہے کہ بالکل بزدل ہی بن جاتا ہے تو شریعت اس بزدلی کی بھی ممانعت کرتی ہے اور تاکید کرتی ہے کہ تم اپنے اندر شجاعت پیدا کرو اگر تم بزدل بنے رہو گے تو جہاد کیسے کرو گے، صبر آزما حالات کا مقابلہ کیسے کرو گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس قدر احساسِ کمتری کا شکار ہے کہ وہ ناشکری میں مبتلا ہونے لگتا ہے تو شریعت کہتی ہے کہ یہ ناشکری تمھیں اللہ کی رحمت سے مایوس کر سکتی ہے اور کفر کے منھ میں دھکیل سکتی ہے۔ کوئی بہت زیادہ احساسِ برتری کا شکار ہے جس سے گھمنڈ اور تکبر میں مبتلا ہو رہا

ہے تو شریعت اس رویے کی بھی روک تھام کرتی ہے کہ تم اپنے اندر تواضع اور عاجزی پیدا کرو، خود کو بہت گھٹیا بھی مت سمجھو اور خود کو بہت اعلیٰ بھی مت سمجھو، اپنے اندر عاجزی کی روش پیدا کر کے اعتدال پر قائم رہو۔

عقل اور جذبات میں میانہ روی

اسی طریقے سے انسان میں عقل اور جذبات کے بہت شدید مادے پائے جاتے ہیں جو کہ اکثر اوقات انسان کو اعتدال پر قائم رہنے نہیں دیتے۔ چنانچہ قرآنی تعلیمات سے ہمیں یہ اہم اصول ملتا ہے کہ تم امتِ وسط ہو، تم دین کا مزاج اور دین کی جو اصل بنیاد اور ریڑھ کی ہڈی ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اپنے جذبات اور عقل کو بیچ میں مت لاؤ۔ چونکہ انسان ایسا ہے کہ کبھی وہ جذبات میں آکر غلط فیصلہ کرتا ہے، اور کبھی اپنی عقل کے خود ساختہ پھندے میں پھنس کر ناقص فیصلہ کر سکتا ہے، نفسانی خواہشات کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس امت کو سمجھایا کہ تم فیصلے اپنی طبیعت کے مطابق مت کرو، بلکہ جیسے شریعت رہنمائی کرے ویسے فیصلے کرو چاہے تمھاری عقل میں آئے یا نہ آئے، چاہے تمھارا دل مانے یا نہ مانے، چاہے تمھاری طبیعت کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ اللہ ربّ العزت نے امتِ محمدیہ کی جو خصوصیت اس آیت میں بیان کی کہ: ''ہم نے تمھیں ایک معتدل امت بنا دیا''۔ اسے سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اپنے ہر عمل میں اعتدال پیدا کرنے کی ضرورت ہے، عقیدے میں بھی، عبادت میں بھی، حقوق کی ادائی میں بھی، خرچ میں بھی، سیاست میں بھی، نیکیوں میں بھی، آپس کے تعلقات میں بھی اور ہمارے مزاج اور اہم فیصلوں میں بھی اعتدال ہونا چاہیے تاکہ ہم امت مسلمہ کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

* * * * *

یسئلونک
دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

کتاب ”احیاء علوم الدین“ اور موضوع روایات

سوال: امام غزالی رحمہ اللہ بہت ہی علمی اور رسوخ فی العلم رکھنے والی شخصیت ہیں، مگر امام غزالی رحمہ اللہ کی کتاب ”احیاء العلوم“ میں کچھ موضوع احادیث بھی موجود ہیں اور مذکورہ کتاب میں موضوع احادیث کی صراحت اور تنبیہ بھی موجود نہیں ہے۔ از راہِ کرم، یہ رہنمائی فرمادیجیے کہ امام غزالی رحمہ اللہ جیسی عظیم شخصیت نے بغیر کسی صراحت کے ”احیاء العلوم“ میں موضوع احادیث کس علت و حکمت کے تحت تحریر فرمائی ہیں؟

جواب: علوم میں رسوخ رکھنے والے حضرات، حدیث کے حوالے سے مختلف مزاج رکھتے ہیں۔ بعض متشدد ہوتے ہیں جو معمولی خرابی کے باعث حدیث کے ضعف کو بیان فرماکرنا قابلِ استدلال قرار دیتے ہیں جیسے امام دار قطنی رحمہ اللہ اور بعض متساہِل ہوتے ہیں جو ہر حدیث کو قبول کرتے ہیں اور بڑی سے بڑی خرابی کے باوجود بھی حدیث قبول لیتے ہیں جیسے امام حاکم رحمہ اللہ، تو معتدل مزاج محققین کے نزدیک دونوں قسم کے اشخاص کے اقوال کا اعتبار اس وقت تک نہیں جب تک کہ کسی محقق محدث نے ان کی تصحیح نہ فرمائی ہو۔ جیسے مستدرک حاکم میں موجود بہت سی احادیث کو امام حاکم نے بخاری ومسلم کے درجے کا کہا ہے جب کہ ان میں بعض روایات ضعیف ہیں تو امام حاکم کی تصحیح کا اعتبار نہیں بلکہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے مستدرک کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد جو کچھ فرمایا اسی کا اعتبار ہے۔ اور علمی رسوخ رکھنے والے کسی امام کا یہ مزاج بعض اوقات علمِ حدیث کے علاوہ دوسرے علوم میں مشغولیت یا غلبے کے باعث ہوتا ہے۔ اور امام غزالی رحمہ اللہ پر بھی چونکہ فلسفہ اور تصوف کا غلبہ تھا اس لیے حدیث میں ان کا تساہُل ہونا کوئی بڑی بات نہیں جب کہ امام غزالی رحمہ اللہ اور ان کی کتاب اِحیاءُ علومِ الدین پر

تنقید کرنے والے حضرات نے بھی اس کی افادیت اور امام غزالی رحمہ اللہ کے علوِّ مرتبت اور جلالتِ شان کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: كلامه في الإحياء غالبه جيد۔احیاء کے اندر اکثر باتیں عمدہ ہیں (فتاویٰ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ، ص:۱۹۴) نیز بہت سے بڑے علما نے امام غزالی رحمہ اللہ کی کتاب احیاء علوم الدین میں موجود احادیث کی تخریج فرمائی ہے جن میں حافظ زین الدین عراقی رحمہ اللہ بہت مشہور ہیں۔ لہٰذا احیاء میں درج شدہ احادیث میں سے جن احادیث کو محققین نے صحیح اور قابلِ عمل قرار دیا انھی کو قابلِ عمل سمجھا جائے گا اور جن احادیث پر کلام کرکے انھیں موضوع قرار دیا ہے ان پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

''الكشف والإنباء على المترجم بالإحياء'' وهو نقد وإصلاح لما ورد في كتاب ''إحياء علوم الدين'' للغزالي من الأحاديث الموضوعة، وكلنا يعلم أن حجة الإسلام الغزالي – رَضِيَ اللهُ عَنْهُ – بالرغم عن علو مقامه في العلوم الدينية وتفرده بالآراء الصائبة في فلسفة الإسلام والأخلاق، لم يكن متحريًا غاية التحري في الأحاديث التي أوردها في تأليفه المتقدم ومن هنا انتقد عليه المازري – وهو المحدث الثقة – تلك الأنقال فأثبت منها ما أثبت، وأسقط ما سواه.(الإمام المازري (ص:٦٤)

كتاب ''إحياء علوم الدين'' لأبي حامد الغزالي فيه من الأحاديث الباطلة جملة، وفيه خيرٌ كَثِيْرٌ لَوْلاَ مَا فِيْهِ مِنْ آدَاب وَرسوم وزهد من طرائف الحكمَاء وَمُنحَرِفِي الصُّوْفِيَّة-(سير أعلام النبلاء ط الحديث (٨٩/١)

وَللإِمَامِ مُحَمَّد بن عَلِيٍّ المَازَرِي الصَّقَلِّي كلامٌ عَلَى ''الإِحيَاء'' يَدُلُّ عَلَى إِمَامته، يَقُوْلُ: وَقَدْ تكَرَّرت مُكَاتبتكُم فِي اسْتَعلاَمِ مَذْهَبِنَا فِي الكِتَابِ المُتَرْجَمِ بِـ''إِحيَاءِ عُلُوْمِ الدِّينِ''، وَذَكَرتُم أَنَّ آرَاء النَّاس فِيْهِ قَدِ اخْتلفت، فطائفةٌ انْتَصَرت وَتعصَّبت لإِشهَاره، وَطَائِفَة حَذَّرت مِنْهُ وَنفَّرت، وَطَائِفَة لِكُتُبِهِ أَحرقت، وَكَاتبنِي أَهْلُ المَشْرِق أَيْضاً يَسْأَلونِي، وَلَمْ يَتقدم لِي قِرَاءة هَذَا الكِتَاب سِوَى نُبَذٍ مِنْهُ، فَإِنْ نَفَّسَ اللهُ فِي العُمُرِ، مَددتُ فِيْهِ الأَنفَاس، وَأَزلتُ عَنِ الْقُلُوب الالْتِبَاس: اعْلمُوا أَنَّ هَذَا رَأَيْتُ تَلاَمِذَتَهُ، فَكُلٌّ مِنْهُم حَكَى لِي نوعاً مِنْ حَالِهِ مَا قَامَ مقَام العِيَانِ، فَأَنَا أَقتصرُ عَلَى ذكر حَاله، وَحَالِ كِتَابِهِ، وَذِكْرِ جُمَلٍ مِنْ مَذَاهِب الموحِّدين وَالمتصَوِّفَة، وَأَصْحَابِ الإِشَارَات، وَالفَلاَسِفَة، فَإِنَّ كِتَابهُ مترددٌ بَيْنَ هَذِهِ الطَّرَائِق.(سير أعلام النبلاء ط الحديث(٢٧٦/١٤)

قسم الذهبي النقاد إلى ثلاثة أقسام:

1۔ قسم متشدد، متعنت في الجرح متثبت في التعديل، يغمز الراوي بالغلطتين والثلاث، كابن معين، وأبي حاتم.

2۔ وقسم متساهل، كالترمذي، والحاكم.

3۔ وقسم معتدل، كأحمد، والدارقطني، وابن عدي. (الطبقات الكبرى – متمم التابعين – محققا (ص:۷۷)

۱۴ مارچ ۲۰۲۲ء

فتوی نمبر:۵۳۴۷

واللہ اعلم بالصواب

* * * * *

مولانا حماد احمد ترک

نائب مدیر ماہ نامہ مفاہیم کراچی

شوقِ شہادت

یہ کون مجاہد ہے جو شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں پھر کر ایک ہی نعرہ لگاتا ہے: لن نعترف بإسرائیل، "ہم اسرائیل کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے" اور ہر جلسے میں یہی دہراتا ہے کہ: لا یوجد دولة اسمها إسرائیل، "ایسی کوئی ریاست ہے ہی نہیں جس کا نام اسرائیل ہو"۔ جس نے اپنا گھر چھوڑا، وطن سے نکالا گیا، اسیری کی مشقتیں اٹھائیں، کتنی ہی بہاریں گنوائیں، قریبی دوست مارے گئے، بچے اور پوتے القدس پہ وارے گئے، کیا کیا دکھ اٹھائے لیکن موت سے ذرا نہ گھبرائے۔ دنیا جانتی تھی کہ رئیس المکتب السیاسي لحرکة حماس، إسماعیل هَنِيَّة جس منصب پر ہیں وہ بہت اہم بھی ہے اور خطرناک بھی، ہر لحظہ ان کی جان خطرے میں ہے۔ لیکن انھوں نے کبھی اپنی جان کی پروانہ کی۔ شیخ عزالدین القسام، شیخ احمد یاسین، دکتور عبدالعزیز الرنتیسی، صلاح شحادہ، عدنان الغول، یحییٰ عیاش، عماد عقل، اسماعیل ابوشنب، رائد العطار، احمد الجعبری، صالح العاروری اور نہ جانے کتنے ہی قائدین، القدس کی راہ میں رتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے، یہ منصبِ بلند ملا جس کو مل گیا۔ دکتور اسماعیل ہنیہ بھی ان شہدا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ابنِ ماجہ کی اس حدیث شریف کا مصداق بن گئے: «يَبتغي الموتَ أوِ القتلَ مظانَّهُ» "ہر اس جگہ قتل اور موت کو تلاش کرتا ہو، جہاں اس کے ہونے کا گمان ہو":

واہ رے شوقِ شہادت کوے قاتل کی طرف

گنگناتا رقص کرتا جھومتا جاتا ہوں میں

اسماعیل ہنیہ شہید کی مظلومانہ شہادت بزدل دشمن کی ناکامی اور نامرادی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مسلمانوں کی اعلیٰ قیادت

کو نشانہ بنانا اسلام دشمنوں کا پرانا وتیرہ ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ منافقین اور یہود کیسے نبیِ اکرم ﷺ کو نقصان پہنچانے اور آپ کی جان لینے کے درپے رہتے تھے۔ خلیفۂ ثانی، امیر المومنین، فاتحِ بیت المقدس سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو کس بزدلی سے شہید کیا گیا۔ فاتحِ بیت المقدس سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کو جنگ میں شکست نہ دے سکے تو خیمے میں سوتے وقت آپ پر بزدلانہ حملہ کر دیا۔ یہی کچھ طویل عرصے سے حماس کے قائدین کے ساتھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔

حالیہ جنگ کے دوران بھی ہم متعدّد فلسطینی قائدین سے محروم ہو چکے ہیں، جن میں شیخ اسماعیل ہنیہ کے بعد دوسرا بڑا نام اِن کے نائب شیخ صالح العاروری کا ہے جنھیں ۲، جنوری کو ان کی رہائش گاہ پر بمباری میں شہید کر دیا گیا۔ اگرچہ نیتن یاہو نے حماس کے سب سے زیادہ مطلوب کمانڈر محمد الضیف کی موت کا بھی اعلان کیا تھا لیکن حماس نے اس کی تردید کر دی۔ یاد رہے کہ محمد الضیف پر اس سے قبل متعدّد جان لیوا حملے ہو چکے ہیں، لیکن ہر حملے میں الضیف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے محفوظ رہے ہیں۔ اسی طرح وزارت برائے داخلی امن کے سربراہ فائق المبحوح الشفا اسپتال پر حملے کے دوران شہید ہوئے۔ انھی شہدا میں اسامہ المزینی بھی شامل ہیں جنھیں ۲۱، اکتوبر کو غزہ میں نشانہ بنایا گیا۔ اسامہ المزینی شیخ احمد یاسین رحمہ اللہ کے داماد اور حماس کے نمایاں قائد تھے۔ ۳، اگست کو مغربی کنارے کے شہر طولکرم میں قسام کے معروف کمانڈر ہیثم البلیدی کی گاڑی پر ڈرون حملہ ہوا جس میں وہ اپنے تین ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔ ۶، اگست کو اسرائیلی فوج نے حماس کے قائد محمد محاسنہ کو فضائی حملے میں شہید کیا اور ان کی شہادت کے مناظر نشر کیے۔ محمد محاسنہ حماس کے لیے اسلحے کی فراہمی کے ذمے دار تھے۔ جس روز شیخ اسماعیل ہنیہ شہید رحمہ اللہ پر حملہ ہوا، اسی صبح حزب اللہ کے مرکزی قائد فواد شکر کو صیہونی میزائل نے بیروت کی ایک عمارت میں نشانہ بنایا۔

شیخ اسماعیل ہنیہ شہید رحمہ اللہ ۳۱، جولائی کو نو منتخب ایرانی صدر مسعود پزشکیان کی تقریبِ حلف برداری میں شرکت کے لیے ایران میں موجود تھے جہاں انھیں ایک عمارت میں میزائل حملے سے نشانہ بنایا گیا۔ شیخ کی پہلی نمازِ جنازہ ایران کے سپریم لیڈر خامنہ ای نے پڑھائی جبکہ دوسری نمازِ جنازہ قطر میں حماس کے رہنما خلیل

الحیۃ کی امامت میں ادا کی گئی۔ ترکیہ اور پاکستان سمیت متعدّد ممالک میں غائبانہ نمازِ جنازہ کا اہتمام کیا گیا۔ بالخصوص آیا صوفیا استنبول اور فیصل مسجد اسلام آباد میں اہلِ فلسطین سے اظہارِ یک جہتی کے لیے مسلمانوں کا جمِ غفیر امنڈ آیا۔ مسجدِ اقصیٰ کے امام شیخ عکرمہ صبری نے نمازِ جمعہ کے بعد شیخ اسماعیل ہنیہ کو شہید قرار دیا اور ان کے لیے دعاؤں کا اہتمام کیا جس پر قابض صیہونی حکومت بپھر گئی اور شیخ کو گرفتار کر لیا گیا۔ شیخ کی گرفتاری پر فلسطینیوں نے شدید احتجاج کیا جس پر انھیں رہا کر کے دو دن کے لیے مسجد سے بے دخل کر دیا گیا۔ بعد میں یہ بے دخلی چھے مہینے تک بڑھا دی گئی۔

پورا عالمِ اسلام اس دل دوز سانحے سے افسردہ اور غمگین ہے سوائے ایک ''قلیل اقلیت'' کے، جنھیں ہمیشہ امت کے مجموعی موقف سے اختلاف رہا۔ یہ طبقہ غالی سلفی علما پر مشتمل ہے جنھیں شہید اسماعیل ہنیہ ایک ''منتخب'' حکومت کے باغی اور ''اِرہابی'' نظر آتے ہیں۔ ذرا مروت ہوتی تو اس سانحے پر سکوت ہی اختیار کر لیتے، نمک چھڑکنا ضروری تھا؟ متعدّد اسلامی ممالک سے تعزیتی پیغامات ارسال کیے گئے، وفود نے شہید رحمہ اللہ کے اہلِ خانہ سے ملاقات کی اور ان کی قربانیوں پر انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ ہاں، سعودیہ، دبئ اور ان ایسے ''اسلامی'' ممالک کے نمائندے مہر بہ لب نظر آئے، اسرائیل کے خلاف ایک جملہ ان کے منھ سے نہ نکل سکا، خیر... اس کی امید بھی نہیں تھی، شکوہ ہی کیا:

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

شیخ اسماعیل ہنیہ شہید رحمہ اللہ کی شہادت کے اگلے دن یکم اگست کو ایک اور عظیم مجاہد، ۲۷ سال صحافی اسماعیل الغول شہید ہو گئے۔ اسماعیل الغول الجزیرۃ کے نوجوان صحافی تھے جو معرکۂ طوفان الاقصیٰ کے آغاز سے غزہ میں نشریات کر رہے تھے۔ یکم اگست کو صحافی اسماعیل الغول شیخ اسماعیل ہنیہ شہید کے تباہ شدہ گھر پہنچے اور ملبے کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر شیخ اسماعیل ہنیہ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ شیخ کے گھر سے واپسی پر اسماعیل الغول کی گاڑی کو راکٹ سے نشانہ بنایا گیا جس میں وہ اپنے کیمرہ مین رامی الریفی کے ساتھ شہید ہو گئے۔ اسماعیل الغول کی داستان نہایت

ایمان افروز ہے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے کیمرے کے سامنے یہ کہنے میں کوئی شرم نہیں کہ میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں، یہاں سب لوگوں کی طرح میں بھی بھوک سے بے قرار ہوں۔ ہم روٹی کے ایک ٹکڑے کو بھی ترس گئے ہیں لیکن یہ حالت ہمارے لیے کوئی عیب کی بات نہیں، عیب تو ان میں ہے جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ اسماعیل الغول نے دھماکے سنے، لاشیں اٹھائیں، جسمانی اعضا بکھرے ہوئے دیکھے، زخمی بچوں سے گفتگو کی، جوانوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے مرتے دیکھا، ان کے دیکھتے ہی دیکھتے پورا غزہ کھنڈر ہو گیا، چالیس ہزار لوگ لقمۂ اجل بن گئے، اسماعیل گرفتار ہوئے، تشدد کیا گیا، دھمکایا گیا، سامان چھین لیا گیا، صیہونوں کے اسیر ہوئے، تحقیر آمیز رویہ برداشت کیا، زخم اٹھائے لیکن ان کا حوصلہ کم نہ ہوا۔ غزہ میں اب تک ۱۶۵ صحافی جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔ اسماعیل الغول، رامی الریفی اور ان ایسے دیگر صحافی خراجِ تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں اپنی جان کا سودا کیا اور غزہ سے نکلنا قبول نہ کیا اور پوری دنیا کو غاصب صیہونیوں کا مکروہ چہرہ دکھانے میں اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔

غزہ اور مغربی کنارے میں اسرائیل کے وحشیانہ حملے بدستور جاری ہیں بلکہ ان حملوں میں بہت شدت آچکی ہے۔ غزہ کی آبادی اور عمارتیں بمباری سے کھنڈر بن چکی ہیں، غزہ کے رہائشی جن کیمپوں میں پناہ گزین ہیں وہاں بھی ڈرون طیاروں، جنگی جہازوں اور توپ خانوں سے شہریوں کا قتلِ عام کیا جا رہا ہے۔ گذشتہ تین ہفتوں سے اسرائیل ان اسکولوں کو نشانہ بنا رہا ہے جہاں عورتوں اور بچوں کی بڑی تعداد مقیم ہے۔ مدرسہ نصر اللہ، مدرسہ حسن سلامہ، مدرسہ حمامہ، مدرسہ خدیجہ اور دیگر اسکول صیہونیوں کی ستم گری کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اگست کے دوسرے ہفتے میں قابض اور وحشی اسرائیل نے کئی ایسے مقامات کو نشانات بنایا جہاں شہریوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ مسجد التابعین پر نمازِ فجر کے دوران بمباری کی گئی جس میں تقریباً سو افراد شہید ہوئے جبکہ زخمیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ جسمانی اعضا ہر طرف بکھر گئے۔ کتنے ہی شہدا ایسے ہیں جن کی اب تک شناخت نہیں ہو سکی۔ اسپتالوں میں کسی قسم کی سہولت موجود نہیں ہے۔ اسرائیلی حملوں میں ۷، اکتوبر سے اب تک ۱۵۲، اسکول تباہ کیے جا چکے ہیں جن میں ۱۰۴۰ پناہ گزین شہید ہوئے۔ غزہ میں اب تک مجموعی طور پر ۳۹۴۸۰ فلسطینی شہید ہو چکے ہیں جبکہ ۹۱۱۲۸ زخمی ہیں۔ ۴۰ ہزار شہدا کی میتیں اسپتالوں تک پہنچیں ہیں باقی

شہدا کا میتوں کا کوئی علم نہیں ہے۔ شہدا میں ۱۶۳۱۴ بچے بھی شامل ہیں۔

قابض صیہونی فوج کے بزدلانہ حملوں کے ردِّعمل میں مجاہدین کی کارروائیاں بھی تیز ہوگئیں ہیں۔ مغربی کنارے میں جنین، طولکرم، القدس، الخلیل وغیرہ میں کہیں بم دھماکے اور کہیں بندوق سے حملے جاری ہیں۔ چاقو سے سپاہیوں اور اسرائیلی شہریوں کو جہنم واصل کرنے کے واقعات تسلسل سے پیش آرہے ہیں۔ اگست کے آغاز میں تل ابیب کے قریب طولون نامی مقام پر ایک چاقو حملے میں دو اسرائیلی شہری قتل اور دو زخمی ہوگئے۔ ان حملوں سے اسرائیلی شہری بہت خوف زدہ ہیں۔ اسرائیلی صحافیوں اور عوام کی جانب سے ان حملوں کا ذمے دار صیہونی وزیر برائے امن ایتمار بن غفیر کو ٹھہرایا جارہا ہے۔ سابق اسرائیلی وزیرِ اعظم ایہود اولمرت اور قائدِ حزبِ اختلاف یائرلاپید نے بھی اندرونی کشیدگی پر بن غفیر کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس وقت نیتن یاہو کو اس وحشت پر آمادہ کرنے اور شہریوں کے قتلِ عام کی حوصلہ افزائی کرنے میں سب سے بڑا کردار اسی لعین کا ہے۔ بن غفیر ایک ایسا رذیل، کمینہ صفت اور متعصب صیہونی ہے جو اسرائیلی ریاست کی بقا کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ جب کبھی نیتن یاہو عوامی مطالبات اور عالمی دباؤ کے زیرِ اثر جنگ بندی کا معاہدہ کرنے لگتا ہے، بن غفیر اسے روٹھ جانے اور حکومت سے الگ ہوجانے کی دھمکی دیتا ہے۔

کتائب القسام، سرایا القدس اور دیگر جہادی تنظیموں کے حملے مسلسل جاری ہیں جن میں ٹینک، بکتر بند اور پیادہ افواج کو یومیہ بنیادوں پر نشانہ بنایا جاتا ہے۔ خاص طور پر القسام نے ۵، اگست کو ایک نئی دھماکہ خیز ڈیوائس سِجِّیل متعارف کروائی۔ یہ ڈیوائس ان میزائلوں سے تیار کی گئی ہے جو صیہونی جہازوں سے گرائے گئے لیکن پھٹ نہ سکے۔ القسام کے نمائندے کے مطابق اس ڈیوائس کے پہلے کامیاب تجربے میں صیہونی سپاہیوں کے ٹکڑے دور دور تک بکھر گئے۔

ایک عجیب واقعہ یہ رونما ہوا کہ اگست کے آغاز میں دائیں بازو کے سینکڑوں مذہبی یہودیوں نے بیتِ لید کی فوجی چھاؤنی پر حملہ کر دیا اور یہ حملہ کئی گھنٹے جاری رہا۔ مختلف چھاؤنیوں سے فوجی دستے اس حملے کو روکنے کے لیے بیتِ لید پہنچے حتیٰ کہ آرمی چیف بذاتِ خود اس حملے کو رکوانے کے لیے متحرک ہوا، حملے کا سبب جاننا چاہیں

گے ؟ سبب یہ تھا کہ اسرائیلی جیل سدیه تیمان میں فلسطینی قیدیوں کے ساتھ "بدسلوکی" پر چند اسرائیلی فوجیوں کو برطرف کر کے تحقیقات کا اعلان کیا گیا، مذہبی یہودیوں کا کہنا تھا ان مشکل حالات میں جبکہ اسرائیل اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے، اپنے سپاہیوں کو گرفتار کرنا صریح ظلم ہے۔ سدیه تیمان میں کیا ہوا تھا اور تحقیقات کیوں شروع ہوئیں، ہم یہ تفصیل آپ کو عن قریب بتائیں گے۔

اسرائیل پر خارج سے حملوں میں حزب اللہ اور انصار اللہ دونوں جماعتیں سرگرم ہیں۔ حزب اللہ کے حملوں کی خبریں تو یومیہ بنیادوں پر الجزیرۃ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس وقت شمالی محاذ اسرائیل کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن چکا ہے۔ خاص طور پر حزب اللہ کے قائد فواد شکر پر میزائل حملے کے بعد لبنان کی جانب سے حملوں میں بہت شدت آگئی ہے۔ کبھی ۲۰، کبھی ۴۰ اور کبھی ۶۰ میزائل بہ یک وقت فائر ہوتے ہیں، بالخصوص ۱۹، جولائی کو لبنان سے ۲۴ گھنٹوں کے ۷۰ میزائل فائر ہوئے جن کا ہدف شمال کے مختلف شہر تھے۔ الجزیرۃ کے مطابق حزب اللہ نے شمالی اسرائیل کے شہروں کریات شمونہ، شتولا، منارہ، میتولا اور متسوفا کو پے در پے حملوں سے ویران کر دیا ہے اور اکثر شہری اسرائیل سے فرار ہو چکے ہیں۔ اسرائیلی فوج کی بہت بڑی نفری شمالی محاذ پر مصروف ہے۔ یہاں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ ۲۷، جولائی کو مجدل شمس میں ایک میزائل حملہ ہوا۔ یہ میزائل مجدل شمس میں ایک کھیل کے میدان میں گرا جس کے نتیجے میں بچوں سمیت ۱۲، شہری ہلاک اور ۳۰، زخمی ہوئے۔ مجدل شمس، شام کی سرحد سے متّصل مقبوضہ اسرائیل میں واقع گولان کے قریب ایک علاقہ ہے جس پر اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد قبضہ کیا تھا۔ اسرائیلی حکام نے اس حملے کو ۷، اکتوبر کے بعد دوسرا بڑا حملہ قرار دیا اور حزب اللہ کو اس کا ذمے دار ٹھہرایا جبکہ حزب اللہ نے شدت کے ساتھ اس حملے کی نفی کی اور اسے اسرائیل کا اینٹی میزائل شیل قرار دیا۔ اس حملے کے بعد سے اسرائیل اور حزب اللہ میں کشیدگی مزید بڑھ گئی۔

معرکہ طوفان الاقصیٰ میں یمنی حوثیوں کی جماعت انصار اللہ کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ انصار اللہ نے تقریبًا آٹھ ماہ سے باب المندب کو بند کر رکھا ہے۔ باب المندب اسرائیل کے لیے اہم ترین آبی گزر گاہ ہے اور اسرائیلی ترجمان کا بیان ہے کہ باب المندب بند کرنا ہمارا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے۔ امریکہ نے برطانیہ اور فرانس

سمیت دس ممالک پر مشتمل خصوصی فوج تیار کی تاکہ انصاراللہ کا محاصرہ توڑ کر اسرائیلی بندر گاہ ایلات تک سامان کی ترسیل ممکن ہو سکے لیکن اب تک تمام کوششیں ناکام ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ متعدّد بار یمنی فضائی حدود میں داخل ہو کر حملہ کر چکے ہیں، سنگین حملوں کی دھمکیاں تو آئے روز دی جا رہی ہیں لیکن یمنی افواج ثابت قدم ہیں۔ اس معرکے میں انصار اللہ کا بھی کافی نقصان ہوا ہے۔ اس آبی گزر گاہ کی بندش سے اسرائیل کو بہت نقصان ہوا، اور اگر اسرائیل کو سامان کی فراہمی مکمل رک جاتی تو یقیناً یہ جنگ اس شدت سے جاری نہ رہتی لیکن وہی ''اسلامی'' ممالک جو شیخ اسماعیل ہنیہ شہید کی تعزیت کے لیے ایک جملہ بھی نہ بول سکے، مستقل اور مسلسل اسرائیل کا سامان اپنی بندر گاہوں سے وصول کر کے زمینی راستے سے اسرائیل تک پہنچا رہے ہیں۔ آفرین ہے اس استقلال پر!

سکوں ہی سکوں ہے خوشی ہی خوشی ہے
ترا غم سلامت مجھے کیا کمی ہے

کچھ عرصہ قبل یمنی فوج انصار اللہ اور عراق کی عسکری جماعت المقاومة الإسلامية في العراق نے مشترکہ کارروائی میں حیفا کی بندر گاہ پر ایک اسرائیلی کشتی کو نشانہ بنایا تھا اور اسے جلانے میں کامیاب رہے تھے، ایسا ہی ایک حملہ ۱۹، جولائی کو کیا گیا۔ الجزیرۃ کے مطابق اس حملے کی ذمے داری انصار اللہ نے قبول کی۔ یمن سے اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب پر کامیاب ڈرون حملہ کیا گیا، نہ کسی راڈار پر اس ڈرون کی اطلاع موصول ہوئی اور نہ ہی آئرن ڈوم اسے روک سکا۔ اس ڈرون نے بحرِ احمر کے راستے دس گھنٹے سے زیادہ سفر کیا، امریکی اور برطانوی بحریہ کے راڈار، اردن کا جاسوسی نظام اور پھر اسرائیلی جاسوسی نظام کو دھوکہ دینے کے لیے ۲۳۰۰ کلو میٹر کا سفر کرتے ہوئے یہ ڈرون تل ابیب کے وسط میں امریکی سفارت خانے کے قریب ایک عمارت کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ یہ ڈرون ایرانی ساختہ ''صماد ۳'' تھا جس کے بارے میں اسرائیل کے ایک فوجی سربراہ آریئل فریش کا کہنا تھا کہ اس نوعیت نے ڈرون حملے روکنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ یہ ڈرون فضا میں مستقل حرکت کرتا ہے اور اپنی جگہ تبدیل کرتا رہتا ہے۔ حجم میں بہت چھوٹا اور سستا ہوتا ہے۔ راڈار سے اس کی نشاندہی کرنا یا اسے آئرن ڈوم سے نشانہ بنانا مشکل ہے۔ اس نوعیت کے حملوں کو روکنے کے لیے ایف ۱۶ طیارے استعمال کیے جاتے ہیں لیکن

ایف ۱۶ سے اس طرح کے ڈرون طیاروں کا تتبع کرنا اور ان کو تباہ کرنا بہت زیادہ مہنگا ہے۔ اسرائیلی ترجمان کے مطابق اسرائیل پر حالیہ جنگ میں یمن سے دو سو ڈرون حملے ہو چکے ہیں۔ اس حملے نے اسرائیل کی ناکامی اور رسوائی میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے، الجزیرۃ کے عسکری تجزیہ نگار حاتم کریم الفلاحی کا کہنا تھا کہ لبنان کے میزائل روکنے میں ناکامی سے یہ واضح تھا کہ صیہونی ریاست کے شمال میں موجود شہری غیر محفوظ ہیں اور اسرائیل ان کا دفاع کرنے میں ناکام ہے، اب معلوم ہوتا ہے کہ پورا اسرائیل ہی غیر محفوظ ہے۔ قائدِ حزبِ اختلاف یائر لاپید نے اس حملے کے بعد نیتن یاہو کی اس صریح ناکامی پر شدید تنقید کی۔ حماس نے اس حملے پر اپنا بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہم انصار اللہ کے اس حملے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ حملہ فلسطینیوں پر وحشیانہ سلوک کا ردِّعمل ہے۔ ۴، اگست کو انصار اللہ نے ایک اور بڑی کارروائی کرتے ہوئے خلیجِ عدن میں ایک بحری جہاز کو میزائلوں سے تباہ کر دیا۔ انصار اللہ کے مطابق یہ جہاز تنبیہ کے باوجود اسرائیل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دن انصار اللہ نے ایک امریکی ساختہ ڈرون ایم۔کیو۹ کو مار گرایا۔ اس جنگ کے دوران یہ ساتواں ایم۔کیو۹ طیارہ ہے جو انصار اللہ نے گرایا ہے۔ ایم۔کیو۹ ایک جنگی ڈرون طیارہ ہے جو امریکی بحریہ کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ۳۰ ملین ڈالر سے تیار کردہ یہ ڈرون ۴۸۲ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرتا ہے اور سنگین جنگی حالات کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس حملے کے دو دن بعد ۶، اگست کو عراق میں عین الاسد میں قائم امریکی فوجی چھاؤنی پر عراقی مقاومت نے کامیاب میزائل حملہ کیا جس میں امریکی سپاہیوں کے زخمی ہونے کی اطلاعات موصول ہوئیں۔

دوسری جانب، فرانس میں اولمپکس کے متعدّد مقابلوں میں فلسطین سے اظہارِ یک جہتی کے لیے فلسطینی جھنڈے لہرائے گئے۔ شائقین مختلف انداز سے فلسطینیوں پر قابض اسرائیلی ریاست کا ظلم دنیا کو یاد دلاتے رہے۔ الجزیرۃ نے ایک اور دلچسپ رپورٹ شائع کی جس میں ایک جاپانی شخص یوسوکی فوروساوا کو دکھایا گیا کہ وہ ٹوکیو کی گلیوں میں تنِ تنہا فلسطین کا جھنڈا لیے پھرتا رہتا ہے، الجزیرۃ نے اسے ”ٹوکیو کی سڑکوں پر غزہ کا واحد مددگار“ قرار دیا۔ یہ شخص ۷، اکتوبر سے اب تک عوامی مقامات، بازاروں، ریلوے اسٹیشن، چوکوں اور چوراہوں پر فلسطین کے جھنڈے لیے پھرتا ہے اور لوگوں فلسطینیوں کی مظلومیت یاد دلاتا ہے۔ مختلف کتبے آویزاں کرتا ہے جن پر ”فلسطین آزاد

ہے"، "انسانیت کا قتلِ عام بند کرو" اور "اب گولیاں چلانا بند کرو" لکھا ہوتا ہے۔ یوسوکی کا یہ فعل بلا شبہ لائقِ تحسین اور قابلِ تقلید عمل ہے کہ انھوں "شکوۂ ظلمتِ شب" پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ "اپنے حصے کی شمع بھی جلائی"۔

غزہ سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر بئر السبع کے قریب صحرائے نقب میں ایک اسرائیلی چھاؤنی قائم ہے جسے سدیه تیمان کہا جاتا ہے۔ خاص جنگی حالات میں یہ چھاؤنی جیل کے طور پر استعمال ہوتی ہے جیسا کہ ۲۰۰۸ء اور ۲۰۱۴ء میں ہوئی۔ ۷، اکتوبر کے حملے کے بعد اسے دوبارہ جیل میں تبدیل کر دیا گیا اور یہاں فلسطینی قیدیوں کے ساتھ گوانتاناموسے کہیں زیادہ گھناؤنا سلوک کیا گیا۔ اس جیل میں قیدیوں کے ساتھ انتہائی سفاکانہ سلوک کیا جارہا ہے۔ فلسطینی شہریوں کو یہاں لاکر ان کے اعضا کاٹ دیے جاتے ہیں، گھنٹوں کھانے، پینے اور حرکت کرنے سے روکا جاتا ہے، ظلم کی انتہا تو یہ ہے کہ ہتھوڑے مار مار شہید کر دیا جاتا ہے۔ اس جیل میں اب تک ۳۶ قیدی تشدد سے شہید ہو چکے ہیں۔ الجزیرۃ کے مطابق چھاؤنی کے اندر تعینات ایک ذمے دار سے رابطہ کیا گیا تو اس کا کہنا تھا کہ یہاں تفتیش اور معلومات اگلوانے کے لیے نہیں انتقام کے لیے تشدد کیا جاتا ہے۔ اس حملے کا انتقام لیا جاتا ہے جو سات اکتوبر کو کیا گیا تھا۔ اس ظلم و جبر کی داستان دنیا میں عام ہوئی تو پوری دنیا میں غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ اقوامِ متحدہ اور ایمنسٹی انٹرنیشل نے فوری طور پر اس جیل کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جسے قابض صیہونی ریاست کے وحشی وزیر برائے قومی امن ایتار بن غفیر نے مسترد کر دیا۔ قیدیوں سے بدسلوکی پر دنیا بھر میں احتجاج کیا گیا۔ بالخصوص آسٹریا، ناروے، اردن، ترکیہ، مراکش، کینیڈا اور جرمنی میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ اس جیل میں قیدیوں کے ساتھ صرف جسمانی ہی نہیں جنسی تشدد بھی کیا گیا، انھیں بے آبرو کیا گیا، ان کی تحقیر اور تذلیل کی گئی، انھیں مستقل بے لباس رکھا گیا، اس غلیظ رویے پر اسرائیل نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنا کر چند افسروں کو گرفتار کیا جو خاص طور پر جنسی تشدد میں ملوث تھے۔ جیسے ہی اس گرفتاری کی خبر منظرِ عام پر آئی، سینکڑوں مذہبی یہودی احتجاج کے لیے نکل آئے اور انھوں نے بیتِ لید کی چھاؤنی پر حملہ کر کے افسران کی رہائی کا مطالبہ کر دیا۔ بعد میں ان گرفتار افسروں کو رہا کر کے گھروں میں نظر بند کر دیا گیا۔

اسرائیلی جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک پر شیخ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے شہادت سے کچھ

دن قبل اعلان کیا کہ ۳، اگست کو فلسطینی قیدیوں کا عالمی دن منایا جائے گا۔ شیخ کی اس خواہش پر عمل کرتے ہوئے پوری دنیا میں ۳، اگست فلسطینی قیدیوں کے عالمی دن کے طور پر منایا گیا۔ فلسطینی اداروں کی طرف سے قیدیوں کے جو اعداد و شمار شائع کیے گئے ان کے مطابق ۷، اکتوبر کے بعد سے مغربی کنارے سے ۹۸۰۰ شہری جبکہ غزہ سے ۵۰۰۰ شہری حراست میں لیے گئے ہیں۔ دورانِ حراست ۴۸ قیدی شہید ہوئے جن میں ۳۶ سدیہ تیمان میں اسیر تھے۔ اسرائیلی جیلوں میں اسیر فلسطینیوں کی حالتِ قابلِ رحم ہے، اُن کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ہوتا ہے۔ اور یہ سلوک صرف مردوں کے ساتھ نہیں خواتین اور بچوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

غزہ سے گرفتار کی گئیں ایک فلسطینی خاتون نے رہائی کے بعد مڈل ایسٹ آئی کو انٹرویو میں جو صورتِ حال بتائی وہ انتہائی شرم ناک ہے۔ یہ خاتون غزہ کے کسی علاقے میں اپنے کم سن بچوں کے ساتھ پانی کی تلاش میں تھیں، بچے پیاس سے بلک رہے تھے، اتنے میں کچھ فاصلے پر موجود ایک صیہونی سپاہی نے انھیں پانی کی بوتل دکھا کر قریب بلایا، بچوں نے انھیں روکا لیکن ماں اپنے بچوں کو پیاس میں تڑپتا کیسے دیکھ سکتی تھی، وہ خاتون اس امید پر سپاہی کے پاس چلی گئیں کہ وہاں سے پانی ملے گا۔ اس سپاہی نے انھیں دھوکے سے بلا کر گرفتار کر لیا۔ ان کے بچوں کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا، وہ بار بار کہتی رہیں کہ بچوں کے پاس کوئی نہیں ہے، اس کے باوجود انھیں ہاتھ پاؤں باندھ کر اسرائیلی جیل منتقل کر دیا گیا۔ جیل میں جو کچھ ہوا اسے لکھنا ناممکن ہے۔ بس اتنا کہہ سکتے ہیں اہلِ فلسطین! ہم شرمندہ ہیں، اے غزہ کی خواتین! ہم شرمسار ہیں، ہمارے پاس غزہ کے بچوں کو بہلانے کے لیے کچھ نہیں، ہاں ہمارے پاس گولڈ میڈل ہے، ہمارے پاس ارشد ندیم جیسا کھلاڑی ہے، ہمارے پاس فنکاروں کے لیے، گلوکاروں اور میراثیوں کے لیے بہت کچھ ہے، ہمارے حکمران بہت سخی ہیں، ایک نیزہ پھینکنے پر کروڑوں روپے لٹا سکتے ہیں، لیکن غزہ کے بچے اب تک ایسا کوئی نیزہ نہیں پھینک سکے جس کے عوض انھیں بھی انعام کا مستحق سمجھا جائے۔ ہماری بہنیں فلسطین میں کوئی ایسا کارنامہ نہیں کر سکیں جو انھیں التفات کے قابل بنائے۔ ہمارے مجاہدین اب تک کسی ”امتیازی“ شان کے حامل نہیں ہو سکے کہ انھیں تمغے کا اہل سمجھتے، اے اہلِ فلسطین! ہم شرمندہ ہیں۔

* * * * *

حماس کے نمایاں رہنما جو طوفان الاقصیٰ میں شہید ہوئے

گذشتہ سال ۷، اکتوبر میں جنگ کے آغاز کے بعد سے آج تک حماس کے جن سرکردہ رہنماؤں کے خلاف اسرائیل نے قاتلانہ کارروائیاں کی ہیں ان کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

فائق المبحوح: ۷، اکتوبر کے بعد اسرائیل نے تحریک اور اس کے عسکری بازو "القسام بریگیڈز" کے متعدّد رہنماؤں کو نشانہ بنایا، جن میں سے حماس کی داخلی سلامتی سروس کے آپریشنز کے سربراہ فائق المبحوح کی شہادت کا واقعہ بھی ہے۔ المبحوح حماس کی وزارتِ داخلہ میں بریگیڈیئر جنرل کے عہدے پر فائز تھے، جبکہ ان کا نام اس کے مسلح ونگ کی عسکری سرگرمیوں سے منسلک نہیں تھا، لیکن وہ اس تحریک کی شہری سرگرمیوں کو منظم کرنے والے سب سے بااثر لوگوں میں سے ایک تھے۔

مروان عیسیٰ: دوسرے قائد مروان عیسیٰ ہیں جنھوں نے غزہ کی پٹی میں حماس کے عسکری ونگ القسام بریگیڈز کے ڈپٹی کمانڈر کے طور پر کام کیا اور ۷، اکتوبر کو ہونے والے حملے کی منصوبہ بندی میں مدد کی۔ انھیں ایک بہت پراسرار شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ وہ جسمانی معذوری کا بھی شکار تھے۔ اس سے قبل بھی اسرائیل نے ان کے خلاف متعدّد قاتلانہ کارروائیاں کیں مگر وہ بچ گئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے قتل کی تصدیق حماس یا اسرائیل نے نہیں کی بلکہ اس کا اعلان امریکہ کی طرف سے آیا ہے۔

ایمن نوفل: القسام کی دوسری اہم شخصیت مروان عیسیٰ کے قریبی رہنما ایمن نوفل کو اسرائیل نے ۱۷، اکتوبر کو نشانہ بناکر شہید کر دیا۔ وہ القسام بریگیڈز کی ملٹری کونسل کے رکن اور غزہ کی پٹی میں سینٹرل ریجن بریگیڈ کے کمانڈر تھے۔ انھوں نے حماس کے میزائل سسٹم کو تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اور اسی طرح وہ اسرائیلی فوجی گیلاد شالیت آپریشن کے منصوبہ سازوں میں سے ایک تھے۔

صالح العاروری: اسرائیل نے ۲ جنوری کو بیروت کے جنوبی مضافات میں ایک عمارت میں قائم دفتر کو نشانہ بنایا اور اس حملے میں حماس کے سیاسی بیورو کے نائب سربراہ صالح العاروری شہید کر دیے گئے۔ اس سے قبل صالح العاروری کو ۱۸، سال تک اسرائیلی جیلوں میں نظر بند رکھا گیا تھا۔ پھر انھوں نے اسرائیلی فوجی گیلاد شالیت کی رہائی کے اس معاہدے میں مذاکراتی ٹیم میں حصہ لیا جس کے نتیجے میں اسرائیل نے ۲۰۱۱ء میں ایک ہزار سے زائد فلسطینی قیدیوں کو رہا کیا تھا۔ آپ کو ملک بدر کیا گیا، اور آپ لبنان میں آباد

ہوئے۔ صالح العاروری شہید نے مغربی کنارے میں القسام بریگیڈز کو مسلح کرنے میں اہم کردار کیا تھا۔

سمیر فندی: سمیر فندی جنوبی لبنان میں حماس کی کارروائیوں کے ذمے دار تھے۔ اسرائیل نے ۲ جنوری کو بیروت میں صالح العاروری کے ساتھ انھیں بھی شہید کر دیا۔

عزام الاقرع: انھیں ۲ جنوری کو بیروت میں صالح العاروی شہید کے ساتھ نشانہ بنایا گیا۔ آپ القسام بریگیڈ کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ آپ لبنان میں مرج الزہور کی طرف جلاوطن کر دیے گئے تھے۔

احمد بحر: آپ حماس کے سیاسی بیورو کے رکن اور قانون ساز کونسل کے نمائندے تھے۔ آپ کو ۱۷ نومبر کو غزہ میں اسرائیلی بمباری میں شہید کر دیا گیا جبکہ آپ فلسطینی قانون ساز کونسل کے قائم مقام سربراہ طور پر فرائض انجام دے رہے تھے۔ اسرائیل کی طرف سے مغربی کنارے میں کونسل کے سربراہ عزیز دویک کو گرفتار کرنے کے بعد احمد بحر اس کے قائم مقام صدر بنے تھے۔

جمیلہ الشنطی: حماس کی نمائندہ اور اس کے سیاسی بیورو کی رکن جمیلہ الشنطی کو گذشتہ سال ۱۸ نومبر کو ایک حملے میں شہید کر دیا گیا۔ وہ تحریک کے سیاسی بیورو میں رکنیت حاصل کرنے والی پہلی خاتون بھی تھیں۔

ایمن صیام: ایمن صیام القسام بریگیڈز میں میزائل سسٹم کے کمانڈر تھے۔ آپ کو گذشتہ سال ۲۶ نومبر کو اسرائیل نے نشانہ بنایا اور شہید کر دیا گیا۔

اسامہ المزینی: اسامہ المزینی حماس کی شوریٰ کونسل کے چیئرمین کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ کو گذشتہ سال ۲۱، اکتوبر کو غزہ میں ہونے والے ایک بم حملے میں شہید کر دیا گیا۔ آپ حماس کے بانی شیخ احمد یاسین شہید کے داماد تھے۔ اسرائیلی سپاہی گیلا د شالیت کی اسیری کے دوران آپ کا نام غزہ میں نمایاں ہوا۔

احمد الغندور: آپ القسام بریگیڈز کی ملٹری کونسل کے رکن اور غزہ کی پٹی میں شمالی بریگیڈ کے کمانڈر تھے۔ آپ کو کئی خودکش کارروائیوں کی منصوبہ بندی کے الزام میں اسرائیل نے چھے سال تک نظر بند رکھا۔ آپ پر اس آپریشن میں حصہ لینے کا الزام تھا جس میں ۲۰۰۶ء میں اسرائیلی فوجی گیلا د شالیت کو پکڑا گیا تھا۔ ۲۰۱۷ء میں امریکہ نے آپ کا نام دہشت گردی کی فہرست میں شامل کیا۔

* * * * *

www.alarabiya.net/arab-and-world